اُردو

قومی یکجہتی اور پاکستان

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

مقدمہ

جمیلُ الدّینؔ عالیؔ

انجمن ترقیِ اُردو پاکستان
بابائے اردو روڈ، کراچی

اُردو

قومی یکجہتی اور پاکستان

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

مقدمہ

جمیلُ الدین عالیؔ

انجمن ترقیِ اُردو پاکستان
بابائے اردو روڈ، کراچی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان ۵۰۳

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح انجمن کو بھی اشاعتِ کتب کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

پہلی اشاعت: ۱۹۹۲ء

طابع: مشہور آفسٹ پریس، کراچی

قیمت: ساٹھ روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل الدّین عالی
معتمد اعزازی

مقدّمہ

تکلف بر طرف اگر اس مقالہ کا عنوان وہ نہ ہوتا جو ہے تو راقم الحروف کو یہ "حرفِ طویل" لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی .... مگر مصنف کا تجویز کردہ عنوان نہیں بدلا جا سکتا (جو برسوں سے معروف بھی ہے)...... بلکہ یہ عنوان پاکستان میں قومی یکجہتی کے ہر آرزو مند اور کارکن کے لیے مزید سوچ بچار اور تحریر کے لیے ایک رہنما ترغیب ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے تک حصولِ پاکستان کے لیے مسلمانوں میں جو بے مثال یکجہتی پیدا ہو چکی تھی یہ کتاب اس کی ایک نہایت بیش قیمت تاریخی دستاویز ہے جو مطالعے، فراست اور محنت سے ترتیب دی گئی ہے۔ ہر باب کے آخر میں تفصیلی اشاریہ اس امر کا ثبوت ہے کہ فاضل مصنف نے کتنی چھان بین کی ہے اور اپنے بیانات کے لیے کیسے مستند ذرائع سے حاصل شدہ شواہد پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی ہے۔

انجمن ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ممنون ہے کہ انھوں نے یہ مقالہ اشاعت کے لیے انجمن کو عنایت کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے اُردو کے کردار پر خاصا قیمتی اور مستند مواد کئی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے مگر وہ اقتصادی اور سیاسی مسائل، معاملات اور مباحث کے ساتھ آمیز ملتا ہے۔ خاص اس موضوع پر راقم الحروف کی معلومات کے مطابق اب تک یہ سب سے جامع اور منفرد دستاویز ہے۔ گو بعض مقامات پر تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے بیانات کسی قدر ان کی داخلیت پسندی یا ان کے اپنے موقف کی روشنی میں مرتب شدہ بھی نظر آتے ہیں مگر اس کا بہرحال انھیں حق ہے۔

تقسیم ہند ایک حقیقت بن چکی ہے۔ پاکستان پر آزادی کے چوالیس سال گزر چکے ہیں اب یہ عرض کرنا کوئی رسم پوری کرنا نہیں بلکہ ایک انسانی دردمندی اور سچائی کا تقاضا ہے کہ ہمیں اور ہندوستانیوں کو مستقبل کی طرف دیکھنا بلکہ اُسے مل جُل کر تعمیر کرنا ہی اَنسب ہے اس طرح کہ ہم اپنے ماضی کی تلخیاں فراموش کرنے کی کوشش کریں، اپنے تعصبات اور شاونیت کو ختم یا فی الحال یہ پوری طرح ممکن نہیں تو انھیں کم سے کم ہی کرتے ہوئے اپنے مشترکہ مصائب و مسائل سے جو سامراج چھوڑ گیا ہے اور جو ہماری غیر متناسب طور پر بڑھتی ہوئی آبادیوں، اقتصادی پس ماندگی،

بعض پارٹیوں، طبقات اور افراد کی تنگ نظری کے پچاک سے آمیز ہیں عہدہ برا ہونے کی مشترکہ منصوبہ بندی پر سوچیں۔ یہ خیال اس وقت صرف ایک آئیڈیل نظر آئے گا لیکن مستقبل یا جدید تر دور میں اکیسویں صدی کے تقاضے (اور بائیسویں بھی آنی ہے) ہم دونوں، بشمول وسط ایشیا کو جلد یا بدیر اس آئیڈیل کی طرف جانے کے لیے مجبور کر کے رہیں گے۔ راقم الحروف اس وقت تقسیم ہند کی مسلمہ ناگزیریت پر مزید روشنی نہیں ڈالے گا۔ صرف اتنا کہنا چاہے گا کہ تاریخ اپنے اس باب کو اَن مٹ طریقے سے لکھ چکی ہے اب اگلے ابواب ہمیں اور آئندہ نسلوں کو لکھنے ہیں۔ اُردو اس مجوزہ قربت میں ایک بڑا کردار ادا کر سکتی ہے۔

تقسیم سے پیشتر ہندی مسلمانوں میں قومی یکجہتی پیدا کرنے یا انھیں علیحدہ قومیت کا احساس دلانے میں اُردو نے ایک مرحلے سے جو کردار ادا کیا اس کی تقریباً تمام تفصیل اس دستاویز میں آ چکی ہے۔ اس طرح یہ مقالہ، یہ کتاب اس موضوع کے طالب علموں ہی نہیں بد قسمتی سے آج پاکستان میں متعدد خطرات میں مبتلا قومی یکجہتی کے قیام اور استحکام پر سوچنے والوں کے لیے بھی نہ صرف ایک مستند پس منظر بلکہ ایک ایسے بابِ نصاب کی حیثیت رکھتی ہے جسے ہم باب اول بھی کہہ سکتے ہیں۔

انجمن نے نہایت خوشی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی اجازت سے اس کتاب کے آخر میں دو اور بیش قیمت مقالے شامل کر دیے ہیں ایک انجمن کے پاکستان میں محسن و متولی پیر حسام الدین راشدی مرحوم کا مقالہ "اُردو زبان کا اصلی مولد سندھ" اور دوسرا جامعہ سندھ کے شیخ الجامعہ، ایک عظیم فرزند سندھ اور پاکستان کے منفرد و نامور مفکر ڈاکٹر آئی آئی قاضی مرحوم کا مقالہ (اُردو ترجمہ از جناب الیاس عشقی) "اُردو کیا ہے"۔ ثانی الذکر مقالہ ڈاکٹر صاحب کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے 1938ء میں "یوم اردو" پر کراچی میں قراردادِ پاکستان، لاہور (1940ء) سے دو برس پہلے پیش کیا تھا اس کے متن میں ڈاکٹر قاضی مرحوم کی ایک اپنی خاص تحقیق کی جھلکیاں بھی ہیں جن کا اشاریہ اتفاق سے دستیاب نہیں لیکن قارئین ملاحظہ کریں گے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے فاضل اجل کی بیشتر کوشش اُردو کے خلاف اس غیر منطقی تعصب کو رد کرنے اور کرانے پر مرکوز تھی جو اس زمانے میں بعض اُردو مخالف حلقوں میں زور پکڑ گیا تھا۔ وقت نے بتایا کہ ڈاکٹر قاضی مرحوم کی یہ کوشش کامیاب رہی اور اُردو کے حق میں سندھ سے بھی اتنے ہی بلند اور موثر نعرے بلند ہونے لگے جتنے دوسرے مقامات سے ہو رہے تھے ..... بر سبیل تذکرہ راقم نے اوسلو میں (ڈنمارک کے شہری مگر ناروے میں اُستاد اُردو ڈاکٹر فین تھینیسین (استاد اردو) سے URD اور URDISH کے الفاظ اور معانی اسکینڈی نیویاتی لغات میں تلاش کرائے (1987ء) وہ ڈاکٹر قاضی کی تحقیق پر حیرت کرتے رہے۔

اس بے مثال پس منظر یہ مواد کے ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا، گو کافی اختصار سے (یہ "حرفے چند" ایک مضمون ہے کوئی باقاعدہ مقالہ نہیں) کہ تقسیمِ ہند یعنی قیامِ پاکستان کے بعد بھی قومی یکجہتی کے معاملے میں اُردو نے کیا کردار ادا کیا، کن دشواریوں سے گزری اب کس حیثیت میں

ہے اور مستقبل کیسا نظر آتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب سے یہ تو واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ قیامِ پاکستان کی وجوہ میں مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی عوامل کے ساتھ ساتھ اُردو کا پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہونا ایک لازمی عنصر تحریک کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کیوں کہ یہ پورے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں ان کی اپنی اپنی بڑی مضبوط مادری زبانیں ہونے کے باوجود ایک مشترک ثقافتی رابطہ و علامت بن چکی تھی اس کے بعد پاکستان بنتے ہی بانیِ پاکستان کا یہ بیان بھی جوان مرحوم و مغفور نے چٹاگام کے ایک جلسۂ عام (1948ء) میں ایک واضح حکم کے طور پر دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہو گی ہماری قومی تاریخ کے ہر ریکارڈ پر ہے۔ لیکن بنگلہ دیش میں اُردو بہ حیثیت قومی زبان کی مخالفت بھی آزادی کے کچھ عرصے بعد سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ دراصل اپنی بیماری اور ایک طویل فضائی سفر کی صعوبت کے باوجود قائد اعظم کے کراچی سے چٹاگانگ جانے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے یہ خطرہ پوری طرح محسوس کر لیا تھا اور مخالفت کے گڑھ میں ہی پالیسی بیان دینے کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ یہ بھی تاریخ ہے کہ اس وقت آپ محترم نے بیرونی شہ پر کام کرنے والے شر پسند مخالفین اور بعض اپنی خود ساختہ سچائیوں کے مطابق مخالفت کرنے والوں کی زبان بھی بہت دن کے لیے بند کر دی تھی۔

لیکن ان کی وفات کے بعد جو اُسی سال واقع ہو گئی دوسرے سیاسی عوامل اور مشرقی و مغربی پاکستان کی باہمی سیاسی کشمکش اور نئے پرانے معاشی تضادات اس طرح ابھرے اور ان میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ اُردو مشرقی پاکستان میں کم از کم نظری طور پر واحد قومی زبان نہ مانی جا سکی گو وہ وہاں حسبِ سابق خوب بولی اور سمجھی جاتی رہی۔ مسلسل سیاسی دباؤ کی الجھنوں سے متاثر ہونے والے ہمارے پہلے دستور (1956ء) کو دو قومی زبانیں ...... اُردو اور بنگلہ ...... تسلیم کرنی پڑیں۔ یہ الگ بات کہ راقم الحروف سمیت لاکھوں کروڑوں مشاہدین کے مطابق اُردو نہ صرف دونوں خطوں میں رابطے کی زبان تھی بلکہ بنگلہ دیش میں خوب بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ جب کہ بنگلہ کا چلن مغربی پاکستان میں تھا ہی نہیں۔ اس لیے کہ اُردو پہلے سے پورے جنوبی ایشیا بشمول بنگال اور آسام میں بول چال، رابطے اور ادب و تدریس کی زبان کے طور پر جم چکی تھی اور بنگلہ اپنی قدامت، اہمیت اور خوبصورتی کے باوجود ایک علاقائی زبان ہی مانی جاتی تھی (اس میں پوتھی ادب کی وجہ سے اس کا ایک بڑا انگ اسلامی تھا) اب بھی ہندوستان میں بنگلہ ریاستی حیثیت کی زبان ہے مگر اپنے ہمسایہ ہندی لپی کے صوبوں مثلاً بہار، سی۔ پی اور یو۔ پی تک میں نہیں پھیل سکی جب کہ (مغربی) بنگال میں بول چال کی اُردو بہ آسانی بولی اور سمجھی جاتی ہے (اُردو ادب اُردو رسم الخط میں بھی زندہ ہے) خود بنگلہ دیش میں بھی یہی کیفیت ہے۔ راقم نے کلکتہ سے ایک دو جلدی کتاب چھاپی تھی (بنگلہ دیش کی علیحدگی سے کئی برس پہلے) جسے پروفیسر شبیر کاظمی مرحوم، پرو وائس چانسلر، جامعہ راجشاہی نے مرتب کیا تھا عنوان تھا "اُردو بنگلہ مشترکہ الفاظ" ..... وہ قومی یکجہتی کی طرف اسی حوالے سے ایک

اضافی کوشش تھی تا کہ اُردو دوست بنگلہ دانشوروں کے ہاتھ مضبوط تر کیے جاسکیں۔ وہ آج بھی بہت سے کتب خانوں میں موجود ہے مگر افسوس سیاست دانوں نے ہمیں ہرا دیا!

چونکہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن کر ایک علیحدہ برادر ملک بن چکا ہے۔ اس لیے اس وقت ہم اپنے محترم برادر ملک میں اُردو بنگلہ کی تلخ غیر ضروری اور محض سیاست زدہ کشمکش کا تفصیلی حال بیان نہیں کریں گے لیکن راقم الحروف ایک مشاہدہ تحریر کرتا چلے پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایک ایسے کارکن کی حیثیت سے اور دیگر منصبی ضروریات کے سبب سے جو شاید راقم الحروف کا تجربہ داخلیت سے بھی آمیز کرسکتا ہے پانچویں دہائی کے آخر سے بنگلہ دیش بن جانے تک وہاں بار بار جانے اور اُردو بنگلہ ادیبوں سے گہرے ذاتی مراسم کے سبب اس موضوع پر بے تکلفانہ گفتگو کا موقع ملتا رہا اس لیے یہ گزارش ضرور ریکارڈ پر رہے کہ وہاں رفتہ رفتہ اعلیٰ سطحوں اور ان سے متاثر عام سطحوں پر اُردو کے خلاف سیاسی مہمات میں وہاں مقیم مغربی پاکستان سے جانے والے سرکاری عہدہ داروں اور اُردو کے نادان دوستوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ اس کی تفصیلی داستان راقم الحروف ایک اندوہناک یادداشت کے طور پر الگ سے تحریر کررہا ہے جو انشاء اللہ کسی دن انجمن یا کسی اور ادارے سے شائع ہوگی۔ ان نادان اُردو دوستوں میں یوپی اور بہار کے بہت سے گھرانے، بعض ادبی مشاہیر اور اعلیٰ مناصب کے اُردو گو اور پنجابی اُردو گو، سرکاری ملازمین خاصی تعداد میں شامل تھے ..... کسی کی مادری زبان کی تحقیر خواہ وہ زبان اپنی وسعت اور ساخت کی وجہ سے نسبتاً "کم تر" ہو کسی کے لہجے اور تلفظ کا استہزا ایک نہایت قابلِ اعتراض غیر اخلاقی اور مصالح مرسلہ کے لحاظ سے بھی بڑا غیر دانش مندانہ رویہ ہے۔ کسی کو کسی کی ماں کا اپنی ماں سے کوئی تقابل یعنی صفاتی موازنہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کسی کو کسی غیر دعویدار سے اپنے معیار کا لہجہ اور تلفظ طلب کرنے کا حق بھی نہیں (راقم الحروف اپنے تخلص کے پہلے حرف کو فنِ تجوید کے مطابق ادا نہیں کرسکتا۔ الف کی صوت ادا کرتا ہے عین کا مخرج جو ریاضت طلب کرتا تھا وہ بچپن میں کرائی نہیں گئی۔ عربی مضمون نہ تھا)

اب مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان میں اُردو کی حیثیت نفاذ اور ضرورت کا ایک طائرانہ مطالعہ یا مختصر جائزہ ..... معذرت کہ یہ ایک تاثراتی گفتگو ہے نہ کہ تحقیق جس کے لیے حوالہ کتب یا کوئی اشاریہ ضروری ہو۔ اتنا یقینی ہے کہ اس میں کوئی واقعاتی غلط بیانی نہیں پائی جاسکتی۔

مغربی پاکستان میں اُردو ایک بڑی اور باہمی رابطے کی زبان کی حیثیت سے کبھی کی جم چکی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اسے قومی زبان کے طور پر صرف ہر سرکاری دفاتر میں انگریزی کی جگہ لینی تھی۔ اس کا کسی بھی علاقائی یعنی پاکستانی زبان سے کوئی تضاد نہ تھا۔ پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے ضلعی دفاتر، ماتحت عدالتوں اور ریونیو ریکارڈ میں پچھلی صدی سے اُردو ہی استعمال ہو رہی تھی (اب بھی ہوتی ہے) صرف سندھ میں انگریزی اور سندھی (اُردو کسی قدر فارسی) کا چلن زیادہ تھا، گو بہت سی کارروائیاں اُردو میں بھی درج کرلی جاتی تھیں ..... وفاقی حکومت چونکہ نئی نئی گورنمنٹ انڈیا تقسیم ہونے کے عمل میں قائم ہوئی تھی اس لیے وہ وراثت میں بہت سے انگریز حکام اور انگریزی

ایک سمت اور ہمہ جہتی آزمائش کا منظر نامہ جو راقم اور اس کے بزرگوں اور ہم عمر لوگوں نے خود دیکھا ہے (اور بڑی حد تک کئی تصانیف میں آ بھی چکا ہے) ایک نہایت ہی پیچیدہ اور صبر آزما جنگی کیفیت کا مرحلہ تھا جس سے بانیانِ پاکستان کی وفاقی کابینہ کو بے سروسامانی کی حالت میں نبرد آزما ہونا تھا اور بحمد اللہ مجموعی طور پر وہ اس میں کامیاب رہے...... ہاں شاید یہ اس وقت بھی ممکن تھا کہ نفاذِ اردو کے لیے سائنٹفک اور مستقبلیاتی بنیادوں پر کوئی منصوبہ بندی مرکز قائم کر دیا جاتا اور ہم اس سمت میں زعمائے قوم کی جستہ جستہ اور انفرادی کوششیں دیکھتے بھی ہیں، شاید ان مخصوص حالات میں وہ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کر سکتے تھے۔ آج اتنے دن بعد کسی کمرے میں بیٹھ کر ان حالات کا خدانخواستہ کوئی الزامی تجزیہ کرنا زبان یا قلم چلانے کی حد تک آزادیٔ فکر و اظہار کے تحفظ میں تو آسکتا ہے لیکن جو لوگ اس آگ کے شعلوں سے گزر رہے تھے اُن کی طرح شمہ برابر بھی محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ بہت ہی نچلی سطح پر سہی راقم ان لوگوں میں شامل ہے۔ جو تعمیرِ پاکستان کی تپش سے کئی برس گزرے......

لیکن آئی جی ہونے کے ساتھ اور اس کے بعد قومی زبان میں جدید تقاضوں کے مطابق پھیلاؤ اور اسے سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کی ضرورت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ ضرورت یقیناً تسلیم بھی کی جا چکی تھی مگر اب اغلباً اقتصادی ناہمواریوں کے دور نہ کیے جانے سے اور کسی حد تک انفرادی انا اور گروہی مفادات پرستی سے بین الصوبائی سیاسی چپقلش شدید طور سے ابھر آئی تھی اور اُردو بھی اپنی تمام تر مقبولیت اور مسلمہ عملی اہمیت کے باوجود اس چپقلش کی نذر ہونے لگی۔ بنگلہ دیش میں اولین شورش اور قائد اعظمؒ کے تاریخی سفر کا ذکر کیا جا چکا ہے اب دوسری اختلافی آوازیں اندرونِ سندھ سے بلند ہوئیں جو کسی حد تک تو "اُردو گو" مہاجرین کی مسلسل آمد اور ان کی آباد کاری کی اقتصادی پیچیدگیوں، شر پسند عناصر کی پیدا کردہ باہمی غلط فہمیوں اور بعض اُردو شاونیت پسندوں یا اُسی پرانے محاورے کے مطابق اُردو کے نادان دوستوں کی مرہونِ منت کہی جا سکتی ہے۔ مگر در حقیقت وفاقی عہدوں پنجاب کی ناگزیر برتری اور بعض اُردو دوست سینئر افسران کے خلاف سیاسی کشمکش کا شاخسانہ تھی۔ راقم بلا تکلف یہ بھی عرض کر سکتا ہے کہ سندھ میں بسنے والے اُردو گو مہاجرین سندھی زبان کی حیثیت اور اہمیت کو پہچاننے میں خاصی تاخیر اور کم نظری کا شکار بھی ہوئے جب کہ اُردو اور سندھی میں نہ پہلے کوئی لڑائی تھی نہ آج ہے۔ 1972ء کے لسانی سمجھوتے کے بعد سے تو (خواہ بعض سیاسی نعرہ باز کچھ کہتے رہیں) بحمد اللہ اُردو سندھی عملاً ایک دوسرے سے بڑی تیزی کے ساتھ قریب آ رہی ہیں کیوں کہ ابتدائی مدارج تعلیم میں دونوں لازمی مضامین ہیں۔ لیکن اسی دوران سندھ میں سیاسی کشمکش نے جو عجیب و غریب کروٹیں لیں انھوں نے اُردو سندھی لسانی قربت پر گہرے سائے ضرور ڈالے ہیں۔ وفاق کے سرکاری دفاتر میں نفاذِ اُردو سے گریز کی کہانی خاصی طویل، عبرت انگیز اور دلچسپ ہے۔ اسے راقم نے کسی قدر اختصار سے انجمن کی تازہ اشاعت "اصطلاحاتِ بینکاری" میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے بہت سے

متعدد مورخین و مفکرین نے بار بار لکھی ہے۔ اس لیے اس وقت اسے دہرانا غیر ضروری ہے۔ یہ کہہ دینا بہت لازم لگتا ہے کہ اگر پچھلے چوالیس سال میں اُردو کو بتدریج بھی نافذ کر دیا گیا ہوتا (جیسا کہ پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں خاصی حد تک ہوتا رہا ہے) تو شاید آج قومی یکجہتی بھی اپنے بہترین مدارج میں داخل ہو چکی ہوتی۔

اب قومی یک جہتی کے حوالے سے چند دوسرے واقعات کا خلاصہ ضروری ہے۔ سیاسی تحریکوں کے جلو میں بعض عناصر نے سوویت پالیسی اور اس کے زیر اثر بعض عناصر نے اپنی سوچوں کے مطابق اُردو کو قومی زبان ہی ماننے سے انکار کرنا چاہا اور اسے محض رابطے کی زبان کا لقب دے دیا۔ دیکھیے ایک مختصر العمر عوامی ادبی انجمن۔ کراچی 72۔1971ء کا منشور جس پر مخدومی جناب فیض احمد فیض نے بھی دستخط کیے تھے۔ وہ غلغلہ کچھ دن رہا۔ پھر ختم ہو گیا مگر ان آوازوں کے بازگشت کئی برس تک آتے رہے۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد سے پنجاب اور وفاق کے خلاف سیاسی تحریکوں کے جلو میں اُردو کے خلاف بھی آوازیں بلند کی جا چکی تھیں جب کہ اردو کی پشتو سے کبھی کوئی لڑائی نہ تھی نہ ہے۔ اس چونکہ پنجابی مادری زبان والوں یعنی پنجابیوں میں پنجابی کے ساتھ ساتھ اُردو پچھلی صدی سے علمی، تحریری، ادبی ذریعہ اظہار کے طور پر اپنائی جا چکی تھی اور وہ وفاق پسند مانے جاتے ہیں اس لیے ان خفا خفا بزرگوں کا نزلہ پنجابیوں کے ساتھ اُردو پر بھی گرتا تھا۔ شکر ہے کہ شکایتیں کم ہو جانے کے علاوہ اور تجارتی وجوہ سے بین الصوبائی مواصلت کی مقدار و رفتار میں بہت تیز اضافے کے ساتھ اُردو کی عملی ناگزیریت واضح ہو چکی ہے۔ چھٹی دہائی میں پنجاب جیسے اُردو صوبہ میں بھی بعض دوستوں نے اپنی سچائی کے مطابق ہی سہی ایک اقدام ایسا کیا جس نے کچھ عرصے تک پھر بالکل غیر ضروری طور پر مخالفت اُردو کی صورت اختیار کیے رکھی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا دستور سب پاکستانی زبانوں کے ادیبوں اور زبانوں پر مشتمل تھا اور سب پاکستانی زبانوں کے ذیلی حلقے بنا دیے گئے تھے جن میں اعزازی عہدیداران اسی زبان کے ادیب بذریعہ انتخاب مقرر کرتے تھے۔ غالباً 1962ء لاہور کے پنجابی ذیلی حلقے کے دفتر سے جالندھر کی کسی پنجابی انجمن نے براہ راست رابطہ قائم کرتے ہوئے گرمکھی رسم الخط میں پنجابی ادب کے تبادلے اور ترویج و اشاعت کی تحریک کی اور ایک بیان کے مطابق یہ تحریک ہمارے پنجابی ذیلی حلقہ لاہور میں پسندیدگی کے ساتھ زیر غور آئی۔ گلڈ کے ضوابط کی رو سے جو منتخب منتظمہ بنائی تھی بیرونی تعلقات کا مضمون مرکزی تھا (جیسا کہ ہر قومی ادارے میں ہوتا ہے) پنجابی ذیلی حلقہ مغربی پاکستان حلقے دفتر لاہور سے وابستہ تھا۔ (اس وقت موجودہ چار صوبے ایک نئی سیاسی وحدت ...... مغربی پاکستان ...... میں ضم تھے) گلڈ کا مرکزی دفتر کراچی میں واقع تھا۔ اس خط کتابت پر مغربی پاکستان کی منتظمہ اور اس کے معتمد اعزازی جناب قتیل شفائی نے اصولی اعتراض کیا جسے ذیلی حلقے کے معتمد اعزازی جناب شفقت تنویر مرزا نے رد کر دیا۔ وہ اُردو روزنامہ "امروز" سے وابستہ تھے۔ راقم اس وقت اعزازی مرکزی ایگزیکٹیو سکریٹری تھا، سکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب (مرحوم) اور اعزازی خازن ابن انشا (مرحوم) ...... راقم اُن دنوں

[illegible] دو ڈھائی برس تک اپنی منصبی ذمہ داریوں کے سلسلے میں تعینات تھا۔ نیابت ابن انشا کے سپرد تھی۔ قتیل صاحب نے شکایت مرکز کو بھیجی (جہاں ابن انشا مرحوم راقم کی نیابت کر رہا تھا) [illegible] نے مسئلہ [illegible] جنرل یعنی قدرت اللہ شہاب کو پیش کی انھوں نے گلڈ کے [illegible] لاہور [illegible] صاحب [illegible] صاحب سے [illegible] دستوری اصولی طور پر کسی بھی ذیلی مرکز کو مرکز سے تعلقات ختم کرنے [illegible] کی تائید کی غیر موجودگی میں گورمکھی رسم الخط کے تعارف، فروغ [illegible] تعلقات کے خلاف فیصلہ دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس مسئلے کو حسب ضابطہ صوبائی مجلس منتظمہ سے [illegible] ہوئے گلڈ کے اجلاس عام کے سامنے رکھا جائے مرزا صاحب یا ان کی ذیلی منتظمہ نے [illegible] تسلیم نہیں کیا اور شہاب صاحب نے تحریری تنبیہ کے بعد قتیل صاحب کی سفارش پر ذیلی حلقے کو معطل کر کے نئے انتخابات کے احکام دے دیے..... اس بات کو تیس برس کے قریب گزر رہے ہیں اور نہ وہ گلڈ رہا ہے نہ راقم 1971ء سے گلڈ کے ساتھ کسی عہدیدار کے طور پر وابستہ۔ اللہ علیم ہے کہ راقم کو اتنی دور ڈھاکہ میں اس تمام صورت حال کی خبر بھی نہ ہوئی مگر بعض جناب کی طرف سے راقم پر یہ الزام لگایا گیا کہ چوں کہ اُردو گو تھا اس لیے شہاب صاحب پر اثر انداز ہوا اور پنجابی ذیلی حلقہ معطل کرایا..... پھر روزنامہ "امروز" اور "پاکستان ٹائمز" میں راقم کے خلاف تو طرح طرح کے خطوط چھپے ہی (اور یہ کوئی اہم بات نہیں راقم شاید اس سے بھی زیادہ مذمت کا مستحق ہو) بہت سے خطوط بنام مدیران میں اچانک پنجابی بمقابلہ اُردو یا اُردو بمقابلہ پنجابی کا قضیہ شروع ہو گیا جس میں بہت سے گمنام خطوط نگاروں کے نام بھی نظر آنے لگے۔ اس قضیے کے اثرات نہایت ناخوشگوار مرتب ہوئے گورمکھی تو دھری کی دھری رہ گئی ایک غیر ضروری جنگ اردو، پنجابی کے مابین نظر آنے لگی۔ اس وقت صوبائی عہدیداروں کے علاوہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم اور پروفیسر حمید احمد خان مرحوم نے جس طرح کھل کر اُردو کی حمایت کی وہ بھی پاکستان میں قومی یکجہتی بذریعہ اُردو کی ایک خوبصورت اور ہمت افزا تاریخ ہے۔ (اُردو کے لیے ڈاکٹر صاحب اور پروفیسر صاحب کی دوسری بے مثال خدمات تو ریکارڈ پر ہیں ہی) شہاب صاحب مرحوم نے یہ سب کہیں لکھا بھی ہے۔ اگلے واقعات گلڈ کے معاملات سے کٹے ہوئے ہیں بہرحال یہاں اس قضیے کا بیان غیر متعلق نہ ہوگا، اس لیے کہ ایک اُردو کے اتنے بڑے مضبوط اور قدیم سے سرپرست صوبے میں جس نے اُردو کو علامہ اقبال جیسی نادرِ روزگار شخصیت عطا کی ہے ایک غیر ضروری تنازعہ کا تاثر یہ وہ صورت حال پیدا کر کے قومی یکجہتی مجروح کر رہا تھا۔ اب بھی گاہے گاہے "پنجاب صرف برائے پنجابی زبان" کی آوازیں اٹھتی ہیں 1989ء میں ایک مقامی سیاسی شخصیت نے اپنی پارٹی کا ایک کل پاکستان ثقافتی جلسہ لاہور میں منعقد کیا تو اپنی تقریر میں نہ جانے کس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے تو ہماری مادری زبان بھی چھین لی گئی ہے.... (حالانکہ ان کی پارٹی دستور 1973ء کے متعلقہ شق کی طرفدار رہی اور ہے جس میں اُردو کو پچھلے دساتیر کی طرح قومی زبان قرار دیا گیا ہے وعدۂ نفاذ کے ساتھ سے...) مگر پنجاب میں ادیبوں، دانشوروں، اساتذہ اور عوام و خواص کی غالب اکثریت

اُردو کو پڑھ چکی ہے وہ پنجابی بولتے ہیں ایک اچھی تعداد بڑا خوبصورت پنجابی ادب بھی تخلیق کر تی ہے پنجابی ایم اے تک تدریس بھی ہے مگر اس سب کا اُردو سے کوئی تضاد نہیں۔ پچھلے کچھ سالوں میں اُردو کو صوبائی سکریٹریٹ اور دوسرے دفاتر میں نافذ کرنے کے لیے واضح فیصلے کے ساتھ چند ماہرین، فضلاء اور تجربہ کار منتظمین پر مشتمل کمیٹیاں بھی بن گئیں جو تیزی کے ساتھ کام کر رہی ہیں ایک اضلاع کے مطابق کم از کم تیس فیصد رودادیں (سمریاں) وزیر اعلیٰ اور کابینہ کو اُردو میں بھیجی جاتی ہیں جو نفاذِ اُردو کی ایک عملی ابتدا ہے۔ تقریباً دو کروڑ روپے اُردو ٹائپ رائٹروں اور کمپیوٹروں پر صرف کیے جانے کی تجویز ہے۔ کئی تربیتی کورسوں کا انتظام ہو رہا ہے۔ اردو مختصر نویسی اور اُردو ٹائپ سیکھنے والے ملازمین کو تشویق ترغیب دینے کی کئی تجاویز مرتب ہو چکی ہیں۔ کمرشل کالجوں میں بھی سہولتیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ ...... ان کمیٹیوں کی نگراں یا بڑی کمیٹی میں نامور اُردو ادیب اور انتظامی ماہرین مثلاً جناب احمد ندیم قاسمی، جناب پروفیسر مرزا منور، جناب اشفاق احمد، جناب مختار مسعود، بیگم بشریٰ رحمن شامل ہیں جب کہ بلحاظ عہدہ صوبائی چیف سکریٹری، ایڈیشنل چیف سکریٹری اور کئی دوسرے اعلیٰ حکام مستقلاً وابستہ رہیں گے۔ چھوٹی چھوٹی نفاذی مجلسیں، کمشنروں کی صدارت میں ڈپٹی کمشنروں اور دیگر عہدیداروں کے مابین شروع ہو چکی ہیں۔

بلوچستان 1969ء کے اواخر میں صوبہ بنا 1970ء کے عام انتخابات نے صوبائی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ (اس سے پہلے وہاں گورنر جنرل مشاورتی امداد سے حکومت کرتا تھا اور مارشل لاء کے زمانے میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر) ...... جب 1971ء میں بنگلہ دیش الگ ہو گیا اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں سول صوبائی حکومتوں کی تشکیل ہوئی تو ابتدائی دور میں مارشل لاء اٹھنے کے بعد (1973ء) صوبوں میں با اختیار گورنر مقرر کیے گئے جو منتخب نمائندے بھی تھے (یہ ایک عارضی دستوری قسم کا انتظام تھا) 1972ء میں پہلے گورنر جناب غوث بخش بزنجو ہوئے جنھوں نے جولائی 1972ء اوائل میں ہی اُردو کو صوبہ کی دفتری زبان قرار دے دیا۔ انجمن نے اس اقدام پر انھیں خصوصی مبارکباد دی تھی ...... اُردو ٹائپ رائٹرز کی کمی اور سی۔ ایس۔ پی حضرات کے عدم تعاون سے وہاں کے دفاتر میں اُردو سو فیصد تو رائج نہ ہو سکی مگر عام شہری اُردو میں بھی درخواستیں دے سکتا ہے اور صوبائی اسمبلی کے ساتھ ساتھ کافی سرکاری کارروائی اُردو میں ہوتی ہے وہاں آج تک بحمد اللہ بلوچی، اُردو تضاد علیحدہ طور سے نہیں اُبھرا، سیاسی عوامل پشتو، بلوچی تضاد گاہے گاہے اُبھار دیتے ہیں ہاں جب معدودے چند سیاست داں اپنی وجوہ سے قومیتیں بمقابلہ یک قومیت کے قضیے اٹھاتے تھے وہ اور چند عناصر بلوچی بمقابلہ اُردو کے قضیے بھی شروع کر دیتے تھے لیکن کچھ عرصہ میں وہ سب دھواں تحلیل ہو جاتا تھا۔ بلوچی زبان اپنی شاندار روایات کے ساتھ زندہ ہے اور تخلیقی پرورش پا رہی ہے اس کے فروغ کے لیے بلوچی اکادمی بھی قائم ہے گو وہ کسی اکادمی کی محتاج نہیں۔ ایک زندہ و توانا زبان کی طرح اپنے ازلی حق کے بل پر بھی پرورش پا رہی ہے اور ترقی کرتی رہے گی۔ اُردو میں بلوچی زبان و ادب کی ایک جامع تاریخ جناب کامل القادری مرحوم نے مرتب کی تھی جسے انجمن کو شائع کرنا تھا انھوں نے تحریر کے ساتھ ہی انجمن کے ذریعے کتابت بھی کرا لی تھی۔ اس میں کچھ وقت لگا

ساتھ ساتھ ہی صوبوں بمقابلہ مرکز کے سیاسی تنازعات زور پکڑتے گئے۔ فوجی کارروائی کی نوبت آ گئی۔

چونکہ اس کتاب میں بلوچی قبائل کا تفصیلی بیان بھی تھا اور اس وقت بلوچستان ایک حساس صوبہ ہو چکا تھا اس لیے ہم نے چاہا کہ بلوچی نسل کے بلوچی کو فضلاء بھی اسے دیکھ لیں تاکہ اشاعت کے بعد کسی متنازع فیہ مسئلے میں ملوث نہ ہو جائے۔ اس عمل میں بعض فضلاء نے چند مقامات پر شبہ ظاہر کیا کہ تنازعات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کامل القادری مرحوم اپنی تحقیق پر مصر اور تحریر میں ترمیم پر تیار نہ ہوئے۔ ہمیں ایسے زمانے میں شدید احتیاط کا پابند رہنا تھا کیوں کہ ہمیں تو بلوچی زبان و ادب کی تاریخ مطلوب تھی بلوچی قبائل پر کوئی متنازعہ فیہ تحقیق نہیں۔ چنانچہ ان کے اور انجمن کے مابین یہ تقسیم ہو گئی کہ انجمن کتابت کے اخراجات خود برداشت کرے گی اور وہ اسے اشاعت کے لیے کسی بھی ناشر کو دے دیں گے۔ ہماری بد قسمتی کہ ہم وہ کتاب نہ چھاپ سکے لیکن ہم ماضی کے تجربات اور اپنی احتیاط کے سبب کسی سیاسی تنازعہ میں حصہ لینا تو کیا حتی المقدور اس کے امکانات سے بھی محتاط رہنے کے پابند ہیں۔ (وہ کتاب شائع ہو چکی ہے شاید اشاعت سے پیشتر مرحوم نے چند مقامات میں ترمیم کر ہی دی تھی لیکن چونکہ مسودہ راقم کے سامنے نہیں اس لیے یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا...... یہ کتاب ایک شاندار اشاعت ہے۔ اس پر کوئی تنازعہ سامنے نہیں آیا ہے)

سرحد میں بھی پنجاب کی طرح اُردو قدیم سے وہاں کی تخلیقی ادب ہی نہیں بڑی حد تک دفتری زبان کے طور پر رائج تھی اور ہے۔ پشتو، ہندکو، ان کی بولیاں اور زبانیں ہیں پشتو میں عظیم کلاسیکی ادب بھی موجود ہے اور آج بھی پشتو نثر و نظم کی تخلیقات پشتو خزانوں میں اضافے کر رہی ہیں سرکاری طور پر ایک پشتو اکادمی بھی قائم ہے۔ دوسرے ادارے بھی فروغ پشتو کے لیے کام کرتے ہیں۔ لیکن بحمد اللہ پشتو اور اردو کے مابین کوئی تضاد نہیں بلکہ پشتو اور ہندکو بولنے اور لکھنے والے بعض ادبا تو اُردو کے اکابر میں شمار ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ان کی تعداد کم نہیں۔ راقم نے 1966ء میں قدیم و جدید پشتو شاعری کا ایک اُردو ترجمہ محترمی فارغ بخاری اور رضا ہمدانی سے کرایا تھا اور ایک کتاب "پشتو شاعری" شائع کی جو اس عظیم زبان کے لیے ہمارے احترام و تعاون کی ایک علامت ہے۔ آج صوبہ سرحد اردو کا ایک مضبوط قلعہ کہلاتا ہے اردو کے قدیم حمد و نعت، سلام، مراثی، قرآن مجید اور احادیث کے اردو ترجمے آج بھی پختون مذہبی محفلوں میں پہلے کی طرح رائج ہیں......

ریاست آزاد جموں و کشمیر آج پاکستان کا سیاسی حصہ نہیں مگر پاکستان سے تجارتی، جغرافیائی، نسلی اور ثقافتی روابط ایسے ہیں کہ کسی لسانی مغائرت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ تقسیم سے پہلے پوری ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی۔ بول چال میں بھی اردو کثیر الاستعمال ہے۔ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی دفتری زبان حسب سابق اردو ہی ہے۔ ان کی اپنی بولیاں بھی ہیں مگر کاروبار اور باہمی تعلقات کی زبان اردو ہے اور جموں و کشمیر کے اردو ادبا و شعراء کی تعداد اور ان کی تخلیق و تحقیق کا معیار ہمیشہ کی طرح آج بھی پوری دنیائے اردو کا مایہ افتخار ہے۔

صوبہ سندھ میں مرکز اور صوبے اور خود صوبے کے اندر باہمی سیاسی آویزشوں کی زد میں اردو کئی بار آئی۔ یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے جو سندھ کے مخصوص حالات اب بھی کبھی کبھی تازہ کرا دیتے ہیں۔ 1972ء میں اس وقت کے گورنر سندھ نے بہ عجلت ایک سخت متنازع فیہ قانون بنانا چاہا جس پر سندھ میں آباد موثر اور فعال اردو گو اور پنجابی گو حلقوں کی طرف سے شدید ردِ عمل ہوا۔ اسی دوران میں جناب رئیس امروہوی مرحوم نے "جنگ" کراچی میں ایک قطعہ چھپوا دیا جس کا آخری مصرع تھا "اردو کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے" اسے روزنامہ "جنگ" کراچی نے صفحہ اول پر سیاہ حاشیوں کے ساتھ شائع کیا۔ دوسری طرف سے بھی شدید ردِ عمل ہوا لسانی فسادات پھوٹ پڑے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے دونوں زبانوں کے وفود اسلام آباد طلب کیے۔ مذاکرات ہوئے پھر وہ خود کراچی آئے۔ مزید مذاکرات کے بعد ایک سمجھوتہ ہوا اور قانون میں متفقہ ترمیمات کی گئیں۔ یہ "لسانی سمجھوتہ" کہلاتا ہے اور آج تک زیرِ عمل ہے۔ ابتدائی نصاب میں اردو سندھی دونوں کی تدریس اور دونوں میں کامیابی لازمی ہے۔ سندھی اعلیٰ ترین مدارج تک پڑھائی جاتی ہے۔ دراصل اردو سندھی لسانی تنازع سیاسی آویزشوں سے پیدا ہوا تھا اور اُسے تقویت ایک تعلیمی رپورٹ (1961ء) سے ملی "شریف کمیشن۔" (ڈاکٹر شیخ محمد شریف مرحوم) وفاقی معتمد تعلیم اس کے سربراہ تھے۔ اس کمیشن نے چند ایسی تجاویز دی تھیں مثلاً قانون کی مدت تدریس پنجاب کی طرح تین سال کر دینا، ثانوی تعلیم گیارہویں جماعت تک لے جانا، سندھی زبان کی اہمیت پہلے کی نسبت کم کر دینا...... کئی سخت متنازع فیہ تجاویز تھیں۔ سندھ میں ون یونٹ کے خلاف پہلے ہی جذبات اُبل رہے تھے۔ چار صوبے ایک صوبے میں ضم کر کے مغربی پاکستان کے نام کا صوبہ بنا دیا گیا تھا اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں مساوات PARITY کا اصول اختیار کیا گیا تھا (یہ ایک سیاسی کہانی ہے) اس رپورٹ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا اور سندھ میں وفاق اور مرکزیت کے خلاف جو تحریکیں چل پڑی تھیں اردو مفت میں ان کی زد میں آ گئی۔ یہی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی جس کا ایک شاخسانہ 1972ء کے محولہ بالا واقعات ہیں۔ رپورٹ کا وہ حصہ تو منسوخ ہو گیا مگر تلخ یادیں چھوڑ گیا۔ بہرحال 1972ء کے لسانی سمجھوتے کے بعد سندھ میں کوئی اردو سندھی تنازعہ بالائے سطح نہیں رہا۔ قومیتوں، قوم، سیاسی حقوق کے مطالبات اور دوسرے قضیوں کا معاملہ علیحدہ، ان پر تبصرے کا یہ محل نہیں۔ لیکن اس موقع پر یہ ضرور اظہار کر دیا جائے کہ سندھ میں انجمن کی باقاعدہ شاخ 36-1935ء میں ہی قائم ہو چکی تھی اور سندھ کے مسلمانوں نے سندھ میں اردو کی جو خدمات انجام دی تھیں وہ ریکارڈ پر موجود ہیں۔

جب بابائے اردو انجمن ترقی اردو کو پاکستان لائے تو اس کا صدر دفتر تلاش کرنے اور انجمن کو اس کا قبضہ دلوانے میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ پیر الٰہی بخش مرحوم اور انجمن کے متولی پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے ہی سب سے زیادہ مدد کی تھی۔ دراصل یہ عمارت جس میں آج بھی ہمارا صدر دفتر اور اردو کالج (فنون) قائم ہے اور جہاں اب بابائے اردو مرحوم کا مزار بھی بن چکا ہے انہی دو صاحبوں اور دیگر سندھی سرپرستانِ اردو نے دلوائی تھی بعد میں پیر حسام الدین راشدی مرحوم

نے جس طرح مسلسل انجمن کی مدد کی اس کا اعتراف ہم اپنی بہت سی اشاعتوں میں کرتے رہتے ہیں۔ پیر صاحب نے مولوی صاحب کی وفات کے بعد بھی انجمن اور اس کے کاموں کو راقم کی معتمدی اور صدر انجمن اختر حسین کی صدارت کو اپنی دل آویز اور مضبوط شخصیت اور اپنے دوست جناب ممتاز حسن مرحوم کی معاونت سے جو سہارا دیا جیسی رہنمائی کی، وہ انجمن ہی نہیں پاکستان بھر میں اردو تحریک کی تاریخ میں ایک بڑا اور درخشاں باب ہے۔ (پیر صاحب مرحوم اردو لغت بورڈ کراچی اور اردو سائنس بورڈ کے بانیان اور نہایت فعال متولیان میں شامل رہے ہیں۔)

اردو کے حوالے سے نہ صرف پنجاب بلکہ سندھ کو بھی پورے پاکستان میں ایک خاص فوقیت کا حامل کہا جاتا ہے۔ گو یہ ایک خالص علمی، تحقیقی مسئلہ ہے لیکن اس کا ذکر زبان پر لانا ان جڑوں کی طرف دوبارہ توجہ دلانا ہے جن سے اردو کا گھنا درخت پھلا پھولا۔ اردو کے بارے میں یہ امر محققین کی توجہ اور محنت طلب کرتا رہتا ہے کہ اس نے کب اور کس علاقے سے شروعات کی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اندازے تو اسے ہزار سال سے بھی قدیم تر بتاتے ہیں اور ہندستانی علاقوں کے حوالے لاتے ہیں مگر علامہ سید سلمان ندوی بڑے بیش قیمت دلائل کے ساتھ اس موقف کے حامی و مددگار تھے کہ اردو دراصل مسلمانوں کی سندھ میں آمد کے ساتھ اسی صوبے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس موقف کی مکمل تائید پیر حسام الدین راشدی نے کی ہے گو بابائے اردو اس سے جزوی اختلاف کرتے تھے اور حافظ محمود شیرانی اردو کا اصل مولد پنجاب کو بتاتے تھے۔ اس وقت راقم ان بزرگوں اور دوسرے محترم محققین کے مختلف مکاتیب فکر کی تفصیل میں نہیں جائے گا۔ مقصد صرف یہ یاد دلانا ہے کہ ایک نہایت ہی محترم مکتب فکر کے مطابق سندھ اردو کا مولد بھی قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی سندھ میں شاہجہانی عہد سے یعنی جب دوسرے علاقوں میں اردو پروان ہی چڑھ رہی تھی اردو شاعری کی ابتدا بھی نظر آتی ہے۔ عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی جو رائج الوقت ادبی زبان فارسی کے شاعر تھے (ان کا فارسی دیوان سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے) اردو کے شاعر بھی کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد ولی کے دو معاصرین کامل صابر اور قاسم کا ذکر ملتا ہے اور پھر میر و سودا کے ٹھٹھوی معاصر تخلص ضیاء نمایاں نظر آتے ہیں۔ ادبی مشاہیر کی نمو ایک ماحول میں ہوتی ہے۔ عام دھارے سے بالکل الگ کسی تنہائی میں نہیں ہو سکتی صاف ظاہر ہے کہ ایک اردو ماحول ہوگا جس نے اوسط تناسب کے مطابق ان اردو مشاہیر کو جنم دیا۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے سندھ میں "اردو شاعری" کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس میں سَو سے زائد ایسے سندھی شعرا کا ذکر ہے جنھوں نے عہد بہ عہد سندھی، ہندی اور فارسی کے علاوہ اردو میں شاعری کی ہے۔ افسوس کہ اٹھارویں انیسویں صدی کے تذکرہ نویسوں کی دست رس فاصلوں، غیر محفوظ راستوں، سیاسی کم ارتباطی اور برطانوی یلغاروں کے سبب سندھ کے ان متقدمین میں اردو تک نہ ہو سکی ورنہ ان کے اذکار اور نہ صرف نمونہائے کلام ...... بلکہ ان پر اس وقت کے رواج کے مطابق تبصرے بھی اپنی تالیفات میں شامل کیا کرتے۔ ضیاء ٹھٹھوی تو بعض دہلوی اور لکھنوی معروف متقدمین سے بھی کہیں زیادہ سینئر ہیں لیکن سندھ کے ممتاز ترین مشاہیر میں حضرت سچل سرمست کا نام بہ حیثیت ایک اردو شاعر بھی لیا جاتا ہے گو ان کی وجہ شہرت ان کا

سندھی فارسی عارفانہ کلام اور صوفیانہ زندگی ہے۔ ان کا بیشتر اردو کلام تو دستیاب نہیں مگر جو مل سکا وہ سندھی ادبی بورڈ شائع کر چکا ہے۔ "سندھ میں اردو" مرتبہ محترمہ ڈاکٹر شاہدہ بیگم، ابو تراب کامل، دوس نصیر، مراد فقیر شاہو خان زنگیجہ، ثابت علی شاہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شاہ (عبد اللطیف) بھٹائی کے بعض اشعار کو بھی اردو قرار دینے کا موقف رکھتی ہیں۔ مگر اس سے پروفیسر غلام ربانی آگرو کو اختلاف ہے اور ان کا کہنا ہے کہ "سندھی علم و ادب کا کوئی بھی محقق یا ماہر ڈاکٹر صاحب کے اس بیان سے متفق نظر نہیں آتا" لیکن اس کا سبب یہ نہیں بتایا کہ خدانخواستہ حضرت شاہؒ اردو سے لاعلم تھے بلکہ یہ "کہ حضرت شاہؒ عربی اور فارسی کے عالم تھے مولانا روم اور حافظ سے ذہنی استفادہ بھی کرتے ہیں مگر سندھی کے علاوہ کسی اور زبان میں شاعری نہیں فرماتے۔ چنانچہ راقم حضرت شاہؒ کو محض سخن سازی کی خاطر اردو شاعروں میں شمار نہیں کرے گا اور یہ کیوں ضروری ہو کہ ہم اپنے موقف کو تقویت دینے کے لیے ایسے محترم بزرگوں سے غیر متحقق باتیں منسوب کریں، "ہمارے لیے ان کے فیوض روحانی اور ان کے ترجموں کے ذریعے ان کی عظمت تخلیق و فکر سے استفادے کی سعادت کم نہیں اور یہ تو بہت ہی بہتر ہوگا اگر ہم سندھی زبان میں دست گاہ بہم پہنچا کر حضرت شاہؒ کے کلام سے براہ راست فیض حاصل کریں ......"

حضرت سچل سرمست کے بعد نمایاں معنوں میں میر عبد الحسین سانگی اور خلیفہ نبی بخش کہے جاتے ہیں۔ سانگی حکمران تالپور کے آخری رکن خاندان تھے جن کی حکومت انگریزوں نے غصب کر لی۔ ان کے کلام کی خصوصیت سوز و گداز ہے جو غالباً اس انتزاع سلطنت کا شاخسانہ بھی ہے۔ ان کا مکمل اردو مجموعہ اور خلیفہ نبی بخش کا مکمل اردو کلام بھی سندھی ادبی بورڈ نے شائع کر دیا ہے۔

سندھ میں جدید اردو نثر دیگر علاقوں میں جدید اردو نثر کے بہت بعد نہیں آئی۔ ایک تفصیل ہے جو متعلقہ تذکروں میں ملتی ہے مگر یہاں ایک بہت بڑے نام کا ذکر لازمی ہے مرزا قلیچ بیگ سے پاکستان کے سب اردو اہل قلم واقف ہیں، ان کی تصانیف کی تعداد سیکڑوں پر جاتی ہے۔ وہ سندھی نثر کے معمار اعظم کہلاتے ہیں مگر اردو نثر میں ان کی تحریریں سندھ میں اردو کے تسلسل اور توسیع کا ثبوت ہیں، اس وقت ہندو اور مسلمانوں میں بول چال کی عام زبان پر رسم الخط کا جھگڑا انگریز نے کھڑا کر رکھا تھا۔ (اسی قضیے نے سر سید کو "ہندوستانیت" سے دل برداشتہ کیا) سندھ کے سندھی ادیبوں میں بھی اس قضیے کے اثرات در آئے تھے۔ ہندو زیادہ تر سنسکرت اور ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے تھے اور مسلمان عربی، فارسی اور اردو کے، اس حوالے سے مرزا قلیچ بیگ جو یوں بھی ایک غیر معمولی شخصیت ہیں مسلم نشاۃ ثانیہ کے ایک فعال عنصر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور اردو کے ایک حامی و مددگار بھی۔

آزادی سے پہلے سندھی کے بعد سندھ میں اردو چلن تو ثابت ہے ہی، پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے بقول پروفیسر ربانی آگرو (صفحہ 34 "قومی زبان" کی ترقی میں صوبوں کا حصہ شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد) اپنی تصنیفات میں اس بات کا اکثر ذکر کیا ہے کہ اس دور کی مردم شماری میں سندھ کے مسلمانوں نے اپنی مادری زبان سندھی کی بجائے اردو لکھوائی تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ اس قومی یکجہتی کا ایک عظیم الشان مظاہرہ تھا جو تیسری دہائی سے مسلمانانِ ہند میں حقوقِ مسلمین کے سلسلے میں پیدا ہو رہی تھی اور جس نے بالآخر پاکستان قائم کرا لیا۔ 1937ء میں علامہ آئی آئی قاضی کی صدارت میں کراچی نے ایک تاریخی یومِ اردو منایا جو بابائے انجمن ترقی اردو کا کام آگے بڑھایا (علامہ مرحوم کا خطبہ زیرِ حوالہ آ چکا ہے اور اس اشاعت کے آخر میں شامل بھی ہے) پیر حسام الدین راشدی کا ایک مقالہ بھی جس میں وہ اردو کا مولد سندھ بتاتے ہیں اسی اشاعت میں شامل ہے۔)

یہ صرف قبلِ آزادی سندھ اردو کا ایک نامکمل سا خاکہ ہے جو اس لیے اس ریکارڈ پہ لایا گیا کہ کاہ کاہ اب بھی کچھ عناصر سندھ میں اردو کو ایک بیرونی زبان قرار دینے پر مصر ہو جاتے ہیں جو صرف آزادی کے بعد ان پر تھوپی جا رہی ہے..... آزادی کے بعد سندھ میں نہ صرف "اردو اسپیکنگ" بلکہ سندھی اسپیکنگ "اردو شعرا، ادبا اور محققین کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان گزارشات میں نہیں سما سکتی نہ یہاں اسے دہرانے کی ضرورت ہے..... راقم اتنا جانتا ہے کہ آج کے دور میں سندھی کے سب سے بڑے شاعر مانے جانے والے ہمارے دوست شیخ ایاز 48۔ 1947ء میں راقم اور دیگر احباب کے ساتھ کراچی کے مختلف ریستورانوں اور محفلوں میں نہ صرف اردو شعر و ادب پر اچھی نظر کا ثبوت دیتے تھے بلکہ اپنی نہایت خوبصورت اردو شاعری بھی سناتے تھے انھوں نے "شاہ جو رسالو" حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی مرحوم کی ضخیم کتاب کا اردو نظم میں جو ترجمہ کیا ہے وہ اردو میں ان کی مہارت اس کے محاورے اور اظہار کی بے شمار جہتوں پر ان کی نظر اور قدرت کا ایک خوبصورت نمونہ ہے..... اب ان کے سندھی مجموعوں کے بعد ان کا اردو مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اگر صوبہ در صوبہ چلا جائے تو یہ پس منظر یہ بیان بہت طویل ہو سکتا ہے جب کہ ایک خاصا مستند مگر کسی حد تک نامکمل جائزہ ایک معاصر ادارے کی ایک پیشین تالیف میں آ چکا ہے (جس سے سندھ کے باب میں اس وجہ سے استفادہ کیا گیا کہ بعض عناصر سندھ میں اردو سے مغائرت کا مسئلہ خاص طور پر اچھالتے ہیں) اس تالیف کا عنوان (جیسا کہ عرض کیا گیا) "قومی زبان کی ترقی میں صوبوں کا حصہ" مرتبہ ڈاکٹر اعجاز راہی، ناشرین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد..... دراصل یہ ڈاکٹر وحید قریشی صدر نشین مقتدرہ کے دور میں ایک سیمینار کی روداد ہے۔ (سال اشاعت 1985ء) جس میں مرتب کی طرف سے چند کلمات کے علاوہ مندرجہ ذیل ابواب شامل ہیں۔

(1) صدارتی خطبہ از جناب اقبال احمد خاں (اس عہد میں وفاقی وزیر عدل و انصاف)
(2) صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کا ایک مختصر مگر بلیغ خطبہ۔
(3) قومی زبان کی ترقی میں سندھ کا حصہ۔ از پروفیسر غلام ربانی آگرو موجودہ صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان
(4) قومی زبان و ادب کی ترقی میں بلوچستان کا حصہ۔ از ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔
(5) قومی زبان و ادب کی ترقی میں صوبہ سرحد کا حصہ۔ از جناب رضا ہمدانی
(6) قومی زبان و ادب کی ترقی میں پنجاب کا حصہ۔ از ڈاکٹر انور سدید۔

تقریباً ایک سو دو صفحات پر مشتمل ایک مستند دستاویزی حیثیت کی تالیف ہے جو وسعت موضوع کے لحاظ سے کسی قدر تشنہ ہوتے ہوئے بھی موجودہ پاکستان میں اردو کے قدیم پس منظر پر رہنمایانہ روشنی ڈالتی ہے۔ راقم اردو اور قومی یکجہتی کے ہر کارکن سے گزارش کرے گا کہ اس کا مطالعہ ضرور کیا جائے۔ آج کے نوجوان جو اردو کے پرجوش حامی بھی ہیں پاکستانی صوبوں میں اردو کی گہری جڑوں سے مناسب حد تک واقف نہیں۔ ان کے لیے یہ تالیف بہت ہی قیمتی مواد اور خدمات فراہم کرتی ہے۔

راقم نے دانستہ کئی دوسرے مباحث اور حوالوں سے گریز کیا ہے کیوں کہ ضخامت اجازت نہیں دیتی اور وہ دوسری اشاعتوں اور مقالوں میں زیر گفتگو بھی آتے رہتے ہیں۔ صرف پس منظر اور حوالہ مسائل کے بعد ایک حقیقت واقعہ سامنے رکھیے تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا عنوان کتاب ہمارے حال و مستقبل کے لیے بھی ایک ہزار معانی کہانی بن جاتا ہے۔

آج کی حقیقت واقعہ

آج کی حقیقت واقعہ کے کئی عناصر جو درج ذیل ہیں خود بولتے ہیں۔

(1) دستور پاکستان کے مطابق اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔

(2) عوامی سطح پر اردو ہی رابطے کی زبان ہے۔ ایک محنت کش تورخم سے برائے معاش کراچی کی طرف چلتا ہے تو مختلف لسانی علاقوں میں صرف اردو ہی کے ذریعے نہایت آسانی کے ساتھ ادائے مطالب و تفہیم مطالب کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔

(3) قومی سطح کے رہنما عوام سے اردو میں ہی خطاب کرتے ہیں ..... چند برس سے وفاق، پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں سالانہ میزانیے یعنی بجٹ کے خطبے اردو میں ہی دیے جارہے ہیں۔ (خواہ بعض دستاویزات کو انگریزی میں چھاپا جائے) سندھ میں بھی بجٹ انگریزی یا سندھی میں پیش کیا جائے تو اردو ترجمہ ساتھ ہوتا ہے۔

(4) اردو روزناموں اور جرائد کی اشاعت تمام اطراف پاکستان تک پہنچنے کے علاوہ بیرونی دنیا کے تقریباً اُن تمام مقامات میں پھیل رہی ہے جہاں پاکستانی کام کرتے ہیں۔ بطور خاص مشرق وسطےٰ، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، اسکینڈے نیویا، شمالی افریقہ، ماریشس، شیسلیز، جاپان، ہانگ کانگ، سنگا پور وغیرہ ...... ہندوستان کا ذکر دانستہ نہیں کیا گیا کیوں کہ اس وقت گفتگو پاکستان میں قومی یکجہتی کے حوالے سے ہے۔ (ہندوستان کے اردو حلقوں میں تو ہمارے روزنامے اور جرائد جاتے ہی ہیں۔ ویسے ہندوستان میں اردو بجائے خود ایک بڑا موضوع ہے۔ عام بول چال میں غالباً سب سے بڑی زبان اور تحریر و ادب میں بھی ایک نہایت ہی اہم زبان ....)

(5) تمام پاکستانی صوبوں میں اردو نصاب تمام مدارج میں نافذ ہے۔ اردو میں مذہبی کتابوں کی تعداد ہمیشہ سے تمام قبل از تقسیم ہندوستانی زبانوں سے کہیں زیادہ تھیں اب تو یہ تناسب اور

بھی بڑھ چکا ہے۔

(6) ماتحت عدالتوں سے لے کر عدالت عظمیٰ تک بہت سا کام اور بطورِ خاص عدالت ہائے عالیہ و عدالت عظمیٰ میں جرح اور دلائل اردو میں بھی مستعمل ہیں۔

(7) جیسا کہ اوپر بتایا گیا، کئی صوبوں کے سرکاری دفاتر میں اردو بھی رائج ہے اور سندھ میں بھی درخواستیں اور دستاویزات اردو میں قبول کی جاتی ہیں۔ پنجاب سرکار میں کامل اردو نفاذ کے لیے نہایت ٹھوس اقدامات پوری تیزی سے کیے جا رہے ہیں۔ باقی تینوں صوبوں کی بلدیاتی کارروائیاں اردو میں بھی ہوتی ہیں۔ اندرونِ سندھ میں بھی اردو کی اجازت ہے۔ کراچی کی بلدیہ عظمیٰ نے اردو کو کبھی سے اختیار کر رکھا ہے۔

(8) پی آئی اے کے جہازوں پر تمام اعلانات انگریزی کے ساتھ اردو میں لازمی ہیں، پاکستان کے فضائی اڈوں پر آنے جانے والی دوسری بیرونی فضائی کمپنیوں کے جہازوں میں ان کی قومی زبان اور انگریزی کے ساتھ تمام اعلانات اردو میں بھی کرتی ہیں۔

(9) پورے ملک میں انگریزی روزناموں کی کل روزانہ اشاعت 1991ء میں بھی ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ نہیں بڑھی جب کہ اردو روزناموں کی مصدقہ تعداد دس لاکھ روزانہ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کی رپورٹ 1990ء) ہفتہ وار اور ماہانہ جرائد کے اعداد و شمار بوقت تحریر دستیاب نہیں۔ اندازہ ہے کہ ہزار سے اوپر ہو چکے ہیں۔

(10) اردو کالجوں (فنون، سائنس، تجارت، قانون) میں سائنس کے بیشتر اور فنون کے تمام مضامین کا اردو میں تدریسی تجربہ یونیسکو نے پانچویں دہائی میں ہی قابلِ تحسین قرار دے دیا تھا اس کے بعد سے ایک آدھ مضمون چھوڑ کر تمام مضامین میں ذریعہ تدریس و امتحانات کے طور پر تمام جامعات میں قابلِ قبول ہو چکی ہے۔

(11) مختلف نجی، نیم سرکاری اور سرکاری اداروں نے اردو لغات، اصطلاحات، معاشی علوم، اقتصادی تجارتی علوم پر طبعزاد تصانیف، تالیفات، ترجموں، قاموس اور (تخلیقی ادب کے علاوہ) دیگر موضوعات پر جتنا کام کر لیا ہے اس کی کوئی جامع فہرست تو تاحال مرتب نہیں ہو سکی لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی مستند کتابوں کی تعداد ہزاروں سے اوپر پہنچ چکی ہے اور اردو کو ہر شعبہ علم میں زیادہ سے زیادہ قابلِ استعمال بنانے کے بے شمار منصوبے پوری تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یوں علوم کے نظری اور عملی تقاضوں کا بڑھتا ہوا پھیلاؤ دنیا بھر کی (نام نہاد) ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مسلسل اضافوں کا طالب رہتا ہے۔ انگریزی جیسی زبان کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی، خلائی علوم، طب بطور خاص جینیاتی انکشافات و تجربات وغیرہ کے لیے ہر سال ہزاروں نئی سے نئی اصطلاحات، الفاظ تک وضع کرنے پڑتے ہیں..... اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اردو میں قرار واقعی سرکاری سرپرستی نہ ہونے سے رفتار کار اتنی تیز نہیں مگر وضع اصطلاحات، ترجموں، مرکبات وغیرہ کے اضافے برابر جاری ہیں۔

(12) اردو میں ہماری علاقائی یعنی پاکستانی زبانوں کے بہت سے صرفی، نحوی اور لغاتی

تراکیب تو ہمیشہ سے آمیز تھے بلکہ بڑی حد تک وہ ان سے مرکب بھی تھی۔ آزادی کے بعد سے وہ بڑی تیزی کے ساتھ نہیں نمایاں طور سے اختیار کرتی جاتی ہے۔ آج ہماری پاکستانی اردو پاکستان کے ہر صوبے اور ہر لسانی عرفیت کا لب ولہجہ بھی اپنا چکی ہے جو اسے حسین تر بنا رہا ہے۔ ور لسانی تشکیلات کے جو مستند تاریخی فارمولے ہیں ان کے مطابق اس کی نئی تشکیل و توسیع کا عمل محسوس و غیر محسوس طریقے سے پورے پاکستان میں جاری رہتا ہے۔ پاکستان میں اردو کا موجودہ تحقیقی ادب قدم قدم پر اس کے نہایت جاندار، خوبصورت نمونے پیش کر رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت واقعہ تھی۔ یہ قومی یکجہتی کی راہ میں مثبت عناصر ہیں جن کی اہمیت اور عملی رسمی قوت مسلم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت واقعہ ہماری قومی زندگی کا ایک تاریک پہلو بھی ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے اور جو قومی یکجہتی کی راہ میں ایک بڑے ہی منفی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وفاق میں 79-1978ء سے بجٹ کی تقریر (نہ کہ بجٹ دستاویز) تو اردو میں ہونے لگی ہے، غیر ملکی سربراہان کے اعزاز میں اور یوم آزادی اور یوم پاکستان پر ہمارے سربراہ مملکت و سربراہ حکومت کے خطبے بھی اردو میں آنے لگے ہیں مگر دستور میں واضح شق اور وعدے کے برخلاف وفاقی دفاتر میں اردو کا نفاذ باقاعدہ طور پر شروع بھی نہیں ہوا۔ عدم نفاذ کے موضوع پر راقم نے کسی قدر تفصیل سے انجمن کی تازہ تالیف "اصطلاحات بینکاری" کے حرفے چند میں روشنی ڈالی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کتاب کا محترم قاری وہ کتاب بھی خریدے ... بلکہ بینکاری میں دلچسپی نہ لینے والا عام قاری شاید اس کتاب ـــ سے کوئی دلچسپی بھی نہیں لے گا۔ اس لیے یہاں وہ سب تو اسی طرح دہرایا نہیں جاسکتا ... (اور وہ ایک پوری، خاصی طویل کہانی ہے) لیکن ان اسباب کا اختصار ضرور کیا جاسکتا ہے جو اردو کے نفاذ کے علاوہ، قومی یکجہتی میں بھی حائل ہو رہے ہیں۔

(1) نفاذ اردو سے بالآخر ملک میں طبقاتی ناہموری کی شدت میں کمی ہو سکتی ہے یہ امکان مفاد پیوستہ اور دور نہ دیکھنے والے اعلیٰ طبقات کو منظور نہیں۔

(2) بعض حکومتیں اپنی جد و جہد بقا میں شدت کے ساتھ مصروف رہنے کی وجہ سے اس طرف بھرپور توجہ نہیں کرتیں، بعض حکومتیں دستور کی اس شق سے مخلصانہ طور پر متفق نہیں عوامی دباؤ کے سبب کھل کر اس کی مخالفت بھی نہیں کرتیں۔

(3) مقابلے کے امتحانات مسلسل انگریزی میں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے امیدواروں کو شروع سے انگریزی میں اختصاص حاصل کرنا پڑتا ہے۔ نوکری ملنے کے بعد سارا کام تو انگریزی میں کرنا ہی ہوتا ہے مزید لازمی تربیت کے مراحل۔ نیپا، ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج میں جو لمبے لمبے دورانیوں کی ہوتی ہے ذریعہ ابلاغ صرف انگریزی ہے۔ یعنی ترقی کے لیے بھی انگریزی میں ہی سب کچھ پڑھنا اور لکھنا پڑتا ہے۔

(4) بیوروکریسی، چند مستثنیات کے علاوہ، نفاذ اردو کے خلاف رہتی ہے کیوں کہ انھیں ڈر ہے کہ وہ اردو تحریر میں اپنا مافی الضمیر روانی اور پوری بلاغت کے ساتھ تحریر نہیں کر سکیں گے،

ماتحتوں کے برابر آجائیں گے (حالانکہ دیگر بہت سے اسباب کی بناء پر ماتحت صرف زبان کی بنیاد پر ان جیسی حیثیت حاصل نہیں کرسکتے) انھیں اس کی عادت نہیں اس لیے الجھن ہوتی ہے۔ حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ یہ ایک ہی مستقل مقتدر طبقہ ہے یہ حکومت کو ڈراتا ہے کہ وفاق میں اردو نفاذ خطرات و انتشار پیدا کردے گا۔ حکومت کا روزمرہ کام بند ہوجائے گا۔

(5) پارلیمان اور اس کے ذریعے کابینہ میں آنے والے زیادہ تر جاگیر دار اور اعلیٰ طبقے سے ہوتے ہیں۔ وہ رعیت اور رعایا کا تصور لے کر آتے ہیں نہ کہ خادم اور خلق خدا کا ..... قومی زبان خلق خدا کی قومی زبان ہے اگر وہ اسے سیاسی خطابوں کے علاوہ دفتری لکھت پڑھت میں بھی استعمال کرنے لگیں تو (وہ سمجھتے ہیں کہ) وہ آہستہ آہستہ رعایا کے برابر ہوجائیں گے ...... حالانکہ اب بیشتر تقریریں اردو میں ہونے لگی ہیں۔

(6) ہمارا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ ..... اور آج کل ہر طرف وہی برسر کار و اقتدار ہے ..... اردو کو شعر و ادب، سیاست، کسی حد تک اور صحافت عوام میں تبادلہ خیال کی زبان تو سمجھتا ہے کام کی زبان نہیں سمجھتا۔ وہ اصطلاحات نہ ہونے کی شکایت کرتا ہے۔ جب اصطلاحات وضع کر کے دکھائی جاتی ہیں تو انھیں مشکل اردو قرار دے دیتا ہے۔ پرانی، مسلم، اصطلاحات کو آؤٹ آف ڈیٹ کہتا ہے۔ سائنس کے جدید سے جدید شعبے میں اردو استعمال نہ ہوسکنے کا ذکر کرتا رہتا ہے جب کہ سائنس اور طب یعنی علوم خصوصی و جدید کی اصطلاح تو خود اچھے سے اچھا انگریزی جاننے والا بھی نہیں سمجھ سکتا تاوقتیکہ وہ سائنس، طب کے متعلقہ شعبے کا طالب علم اور ماہر نہ ہو۔ سائنس کے بعض علوم بعض شعبے اس تیزی سے پھیل رہے ہیں کہ بڑے بڑے مغربی اداروں نے ان کے لیے وضع اصطلاحات کے خاص انتظامات کیے ہیں اور پھر بھی اظہارات کے مطالبے پورے نہیں کر پاتے۔ طبیعات، طب (بطور خاص نئے نئے انکشافات) اور معاشیات میں جو نئے سے نئے بلکہ انقلابی تصورات داخل ہورہے ہیں وہ خود انگریزی اور سبھی یوروپین، زبانوں کے لیے اظہاری مسئلہ بنے ہوتے ہیں۔ ان اظہارات کے لیے لغات مروجہ میں الفاظ نہیں ہیں۔ چنانچہ کبھی قدیم یونانی، کبھی لاطینی سے استفادہ کر کے، کبھی دوسری زبانوں کے قریب المعنے الفاظ سے آمیز کر کے کبھی کوئی بالکل باہر کا لفظ اپنا کر اصطلاحیں بنائی جاری ہیں۔ یہ علوم جدید کے لاانتہا پھیلاؤ کے ساتھ ایک مسلسل عمل شروع ہوا ہے جو جاری رہے گا۔ مگر ہمارے شاہ ذہنیت زدہ انگریزی پسند یہ سب انگریزی زبان کے لیے تو جائز رکھتے ہیں قومی زبان میں وضع و تعارف اصطلاحات کو ایک بے کار، مشکل سے سمجھ میں آنے والا بلکہ سمجھ میں نہ آنے والا اقدام قرار دیتے ہیں۔ جب کہ قومی زبان میں ایک مخصوص مکتب فکر جس سے راقم بھی متفق ہے سائنسی اور طبی شعبوں میں ایسی ہزارہا انگریزی اصطلاحوں کو من و عن اردو میں سمولینے کے حق میں ہے جو بین الاقوامی حلقوں میں زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں ...... بہرحال اصطلاحات نہ ہونا یا "اچھی مستند" اصطلاحات نہ ہونا ایک الزامی حربہ ہے جس کے ذریعے اردو نفاذ کو بار بار روک دیا جاتا ہے جب کہ وضع اصطلاحات کا کام مسلسل اور بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

(7) باہمی سیاسی پیچیدگیوں میں "لسانی مسئلے" کو (جب کہ اکثر اوقات اس وقت اس کا وجود

ہی نہیں ہوتا) آمیز کر کے غلط [illegible] بات میں دی ہوتی ہے۔

(8) انگریزی ایک وقار اور برتری کی علامت کے طور پر تسلیم کی گئی ہے اور اس حیثیت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(9) [illegible]

[illegible]

[illegible]

ہیں۔

(10) کہا جاتا ہے [illegible] پاکستانی [illegible] علاقائی زبانوں کا مسئلہ کھڑا کر کے [illegible] کی جاتی ہے جب کہ اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ یہ چند [illegible] محض چند [illegible] عناصر ہیں جو ایک تاریخی مسلمہ حقیقت واقعہ پیش کرتے ہیں

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ آج کی حقیقت واقعہ ہے صرف چند عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے ان تمام میں یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اگر ہمیں پاکستان میں قومی یکجہتی کا قیام و استحکام مطلوب ہے تو دوسرے سیاسی، سماجی، اقتصادی اقدامات کی اہمیت اپنی جگہ، لسانی سطح پر اس کا ذریعہ اردو اور صرف اردو ہے انگریزی یا کوئی دوسری زبان نہیں جب کہ انگریزی کی بین الاقوامی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اپنے اپنے دائرہ کار میں پاکستانی زبانوں کی ناگزیریت فروغ اور استحکام کی اہمیت تو مسلم ہے ہی۔ ایک بار پھر دہرا دیا جائے کہ اردو کا کسی بھی مقامی زبان سے کوئی تضاد نہیں بلکہ اردو اپنی وسعتوں کے لیے ان سے مسلسل تعاون کرتی رہے گی جو ایک جدلیاتی اور لسانیاتی لازمہ ہے۔

اردو نے تحریک پاکستان کی راہ میں قومی یکجہتی کے لیے جو کردار ادا کیا وہ فاضل مصنف ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی زیر نظر کتاب سے ثابت ہے۔ جب اردو قیام پاکستان کا ایک اشتراک کی مذہب کے بعد غالباً سب سے بڑا محرک ثابت ہو چکی ہے تو تاریخی تسلسل کا فارمولا لازمی طور پر اس موقف کی طرف لے جاتا ہے کہ وہی پاکستان میں قومی یکجہتی، اس کے استحکام اور ترقی پذیر مستقبل کی راہ میں ایک ناگزیر ذریعہ ہے۔

جو عناصر آج بھی قیام پاکستان کی تاریخی ناگزیریت تسلیم نہیں کرتے (اور انھیں اس کا فکری حق ہے یا نہیں یہ الگ بحث ہے راقم ضرور یہ ناگزیریت تسلیم کرتا رہا ہے اور کرتا ہے) ان سے مہیان پاکستان کے مباحث مختلف تحریروں اور مجالس میں جاری رہتے ہیں یہاں انھیں دہرانے کا موقع نہیں لیکن جو عناصر قیام پاکستان، قومی یکجہتی اور استحکام پاکستان کے حق میں ہیں اور پاکستان کا مستقبل بہتر سے بہتر بنانے کے خواہاں انھیں ہر سطح پر اور ہر جائز طریقے سے اردو کے تحفظ و فروغ کے لیے ہر کام کرنا ہوگا۔ ایک قوم کے لیے ایک زبان ضروری ہوتی ہے۔ اگر پاکستانی اپنے

آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں تو انھیں کی قومی زبان کو دستور کے مطابق معروضی حقائق کے مطابق او تعمیر مستقبل کے لیے اردو کو ہی وفاقی سرکاری دفاتر میں بھی نافذ کرنا ہوگا جس کی تیاریاں ہر طرح مکمل ہو چکی ہیں۔ یقیناً بہت سے شعبہ ہائے حیات کے جدید اور آنے والے عملی تقاضے انگریزی او دوسری بڑی بین الاقوامی زبانوں کی طرح اس میں اضافوں کا مطالبہ بھی کرتے رہیں گے مگر جیسا کہ عرض کیا گیا ایسے اضافے وضع اصطلاحات اور ترجموں کے ذریعے اب بھی ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے......

انجمن نے آزادی سے قبل قومی یکجہتی کے لیے اردو کے ذریعے جو کردار ادا کیا وہ کئی دوسری اشاعتوں کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی زیر نظر کتاب سے ظاہر ہے۔ آزادی کے بعد بھی انجمن کی خدمات جاری ہیں، جن کی تفصیل ہماری اشاعتوں اور جرائد کے ذریعے سامنے آتی رہتی ہے لیکن آزادی کے بعد سے قومی اور تجارتی جمع قومی مقاصد کے تحت بہت سے دوسرے نیم خود مختار اور سرکاری اور نجی اداروں نے ترقی اردو کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں انجمن خدانخواستہ معاملت اردو کی اجارہ دار نہیں وہ ان سب سے تعاون کرتی رہی ہے اور سب کی کامیابی کے لیے دست بدعا رہتی ہے ......اردو پر پہلے بھی کسی کا اجارہ نہیں تھا اب بھی نہیں ہے۔ ذمہ داری سب کی تھی اب بھی ہے۔

ہاں ابھی وہ وقت آنا ہے جب کوئی پاکستانی نہایت مسرت و اعتماد کے ساتھ پاکستان میں اردو کا طربیہ لکھے گا۔ وہ بابائے اردو کے کتابچے (پاکستان میں اردو کا المیہ) کا داغ بھی دھوئے گا اور ہمارے عظیم قومی مستقبل کی ایک مستحکم ضمانت بھی بن جائے گا وہ وقت دور نہیں ...... گو قریب بھی نظر نہیں آتا (کیوں کہ جب تک اردو وفاقی دفاتر میں نافذ نہیں ہوتی انگریزی کی غیر متناسب اہمیت، اس کے، پاکستان کے، عظیم ترین امکانات پر تاریک سائے ڈالتی رہے گی....) اگر ہمارے اربابِ اختیار چاہیں تو وہ وقت بہت قریب آسکتا ہے۔

1991ء

باب اول

قومی یکجہتی کا پس منظر و محرکات

"پاکستان۔ جس میں، آج ہم ایک آزاد قوم اور خود مختار اسلامی مملکت کے وارث کی حیثیت سے رہ رہے ہیں اور جس کی قومی زبان اسی علاقے کی زائیدہ پروردہ اور مقبول عام زبان "اردو" ہے، بظاہر چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا ہے، لیکن جس خاص نقطہ نظر کے تحت پاکستان نے جنم لیا اور جسے بہ مشکل منوانے کے بعد ہمیں قومی آزادی و قومی زبان، میسر آئی اس کی تاریخ نئی نہیں، کئی سو سال پرانی ہے، اتنی ہی پرانی جتنی کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد۔ اس لحاظ سے قائد اعظم کا یہ فرمانا ان کی بصیرت کا ثبوت ہے کہ "پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو پہلی قوم کا فرد نہ رہا ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا اور ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی"[1]

مسلم قومیت کی بنیادی سچائی یہی تھی، اس سے انکار نہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے ہزار سالہ ملاپ نے ایک دوسرے کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، ان کے فکر و نظر، علم و عمل، رہن سہن، اخلاق و اطوار، سماجی رسوم و آداب اور علوم و فنون، سب پر ایک دوسرے کا اثر پڑا اور ان کی زندگی کا وہ اسلوب قائم نہ رہ سکا جو دونوں قوموں کے ملاپ سے پہلے تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ سرکاری دفتروں، کاروباری اداروں، نجی محفلوں، بازاروں، تقریبوں اور علمی و ادبی مجلسوں اور تصرف و درویشی کے حلقوں میں ایک دوسرے سے ملتے، گھومتے پھرتے، خاطر مدارات کرتے اور غم و خوشی میں شریک ہوتے لیکن باہم شادی بیاہ اور کھانا پینا ممکن نہ ہوا۔ دونوں کے طور طریقے، دینی عقائد و ملی نظریات اور عبادت و ریاضت کے آداب، ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف رہے۔

ہندو مسلم قومیت کا یہی فرق تھا جس نے بعد کو ایک خاص نقطہ نظر کی
شکل اختیار کی اور پاکستان کو جنم دیا۔ برصغیر کی ہندو مسلم سیاست کے حوالے سے اس
نقطہ نظر کا نام عرف عام میں دو قومی نظریہ ہے۔ دو قومی نظریے کا سادہ سا مفہوم، جیسا کہ
قائد اعظم کے مذکورہ بالا فقروں سے ظاہر ہے، صرف اس قدر ہے کہ برصغیر میں ایک
نہیں دو بڑی قومیں، ہندو اور مسلمان آباد ہیں اور قومیت کی ہر تعریف کی رو سے یہ اپنی اپنی
جگہ مکمل و منفرد اکائیاں ہیں۔ یہ نہ تو ایک دوسرے میں ضم ہو سکتی ہیں اور نہ ایک
دوسرے کے وجود کو خطرے میں ڈالے بغیر متحد ہو سکتی ہیں۔ یہ ایک ایسی سچائی تھی
جس کا برملا اظہار مسلمانوں کی طرف سے برصغیر کی سیاسی بساط پر پہلے پہل اگرچہ ۱۸۵۷ء
کے بعد کیا گیا لیکن اس کا احساس ہندو اور مسلمان، دونوں میں پہلے سے موجود تھا،
خصوصاً ہندوؤں کو روز اول سے اس کا احساس تھا۔ چنانچہ البیرونی، اب سے ایک ہزار
سال پہلے جب محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا تو ہندوؤں کے متعلق اس نے اپنے
خیالات اس طور قلمبند کئے۔

"ہندو دین میں ہم سے کلی مغایرت رکھتے ہیں۔ غیروں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی
ناپاک کہتے ہیں اور ان کو ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، ان کے
قریب جانا، یا ساتھ بٹھانا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے اور اس چیز میں غیر قوم کی آگ یا
پانی سے کام لیا گیا ہے، جن دو چیزوں پر ضرورتِ زندگی کا مدار ہے اس چیز کو ناپاک سمجھتے
ہیں، مزید برآں کسی طریقے سے اصلاح حال کی صورت ہی نہیں ہے اس لئے کہ گو نجس چیز
طاہر سے مل کر طاہر ہو سکتی ہے لیکن ہندو کسی شخص کو جو ان کی قوم سے نہیں ہے اور ان
میں داخل ہونے کی رغبت یا ان کے دین کی طرف میلان رکھتا ہے، اپنے اندر داخل کرنے
کی مطلق اجازت نہیں دیتے۔"

البیرونی کے یہ مشاہدات حقیقت پر مبنی تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف
اپنے اس جذبۂ نفرت کو اگرچہ ایک مدت تک بعض وجوہ سے چھپانے اور دبانے رکھا اور
جب تک مسلمانوں کی سیاسی گرفت برصغیر پر مضبوط رہی اسے ظاہر نہ ہونے دیا لیکن جیسے
ہی یہ گرفت کمزور ہوئی اور برطانوی تسلط کے امکانات روشن ہوئے وہ مسلمانوں کو حقارت و
نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

مسلمانوں میں البتہ، ملی احساس، بہت دیر کو اس وقت پیدا ہوا جب کہ اورنگ
زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور ان کے قومی

وجود کو سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں اور ہندو انگریز گٹھ جوڑ نے خطرے میں ڈال دیا تھا۔ مسلمانوں میں اس ملّی احساس کے آثار اگرچہ مجددالف ثانی کے یہاں بھی مل جاتے ہیں اور بقول شیخ محمد اکرام، "ان کی نگہ تیز بین نے اندازہ لگالیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات اتنے بنیادی ہیں کہ دین الٰہی کا منصوبہ بنا کر رام اور رحمان کو ایک کر کے انھیں جوڑا نہیں جا سکتا، یہ ایک سعی لاحاصل ہے یا خرابیوں کا پیش خیمہ۔۔۔اور بہر کیف اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔" لیکن مسلم قومیت کی مربوط اور واضح شکل شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۲ء) کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کا یہ ملّی احساس، برصغیر کے مسلمانوں کے ہر طبقے اور زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مسلمان بادشاہوں، امیروں، وزیروں، فوجیوں، صنعت کاروں، عالموں، صوفیوں، پیروں، پیرزادوں، واعظوں، مولویوں اور گوشہ نشینوں، سب کو مخاطب کیا اور اس انداز سے کہ کم و بیش سبھی، خواب غفلت سے چونک اٹھے۔ انھوں نے نادر شاہ درانی کے حملے پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ اس کا حملہ برصغیر کے مسلمانوں کے حق میں بڑا تباہ کن تھا اور احمد شاہ ابدالی کو ۱۷۶۱ء میں اسلئے حملے کی دعوت دی کہ وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مظالم سے نجات دلا سکتا تھا۔ ایسا ہی ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے نے مرہٹوں کی کمر ایسی توڑ دی کہ پھر ان میں کسی پر حملہ آور ہونے کی قوت باقی نہ رہی۔ "ان کے سارے نامور جنگجو مارے گئے اور جانبازوں کی پوری نسل کا خاتمہ ہو گیا۔" مشہور مرہٹہ سردار، پیشوا پونے میں بیمار پڑا ہوا تھا، اس کا بھی اس شکست کے غم میں انتقال ہو گیا۔
یہ الگ بات ہے کہ اس فتح سے مسلمانوں کو بھی کوئی خاص فائدہ نہ پہنچا۔ احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کے بعد مسلمان حکمرانوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اپنے تدبر سے اس کی فتح مندی سے فائدہ اٹھا سکتا، نتیجتاً ہندوستان کی سلطنت رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر انگریز کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک نے مسلمانوں میں جو بیداری پیدا کر دی تھی وہ آگے چل کر مسلمانوں کے بڑے کام آئی۔

شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد ہر چند کہ ان کے بیٹوں اور شاگردوں، خصوصاً سید احمد شہید بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید اور شاہ عبدالعزیز، وغیرہ نے ان کی تحریک کو جاری رکھا اور اس میں شبہ نہیں کہ انہیں کی جدوجہد آزادی اور کارناموں کی بدولت مسلمانوں میں وہ جذبہ حریت بیدار و متحرک رہ سکا جو آگے چل کر برصغیر کی ملت اسلامیہ کو انگریزوں کی

غلامی سے نجات دلانے اور ہندوؤں کی محکومیت سے محفوظ رکھنے میں کارگر ثابت ہوا۔
لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت پر جو زوال آنا شروع ہوا تھا وہ
رک نہ سکا۔ ۱۷۶۵ء تک بنگال اور شمالی ہند کا پورا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل کر عملاً
ایسٹ انڈیا کمپنی کی نگرانی میں جاچکا تھا۔

جنوبی ہند میں ایک میسور کی مسلم ریاست تھی جسے ٹیپو سلطان کی وجہ سے انگریز
اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت کے بعد یہ خطرہ بھی باقی نہ رہا۔
انگریزوں نے پورے برصغیر پر اپنا تسلط قائم کرلیا اور سب سے پہلے مسلمانوں کے نظام
تعلیم پر ضرب لگائی گئی۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال
میں ولیم جونز کی سربراہی میں قدیم ہندومت اور مردہ سنسکرت زبان کے احیا کی غرض
سے جو کام شروع کیا گیا تھا اسے ایک نیا موڑ دے دیا گیا۔ للولال جی سے "پریم سبھا"
کے نام سے جدید ہندی میں ایک کتاب لکھوا کر ناگری رسم الخط میں چھاپی گئی۔ یہیں سے
اردو کے مقابلے میں ہندی کا نام سننے میں آیا ورنہ اس سے پہلے بقول ڈاکٹر تارا چند۔
"جدید ہندی کا کہیں کوئی وجود نہ تھا"[۱۸]

مسلمانوں کے عہد تک پورے برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی اور سرکاری و عدالتی
زبان فارسی تھی۔ فارسی کو ایک ایسے رابطے کی زبان کی حیثیت حاصل تھی جس کے ذریعے
مسلمان اپنے اندر ملّی وحدت کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھ سکتے تھے اور اپنے بعض
مسائل کا حل بھی تلاش کر سکتے تھے لیکن انگریزوں کا مقصد چونکہ مسلمانوں کو سماجی اور
اقتصادی طور پر کمزور تر کر کے ان کی انفرادیت و اجتماعیت کو ہر طرح ختم کرنا تھا۔ اس
لئے دیسی زبان کو فروغ دینے کے بہانے ۱۸۳۷ء میں فارسی کو ہٹا کر اردو کو سرکاری
زبان بنانے کا اعلان کیا گیا۔ یہ محض ایک شعبدہ تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کی اس
ناراضگی کا سدِّ باب کرنا تھا جو فارسی کو ختم کرنے سے پیدا ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ جس
وقت یہ حکم جاری ہوا اسی وقت میکالے کی وہ تعلیمی یادداشت منظرِ عام پر آئی جس میں کہا
گیا تھا کہ ہندوستان میں ساری تعلیم انگریزی میں ہونی چاہئے اور جس کا مقصد ایک ایسا
طبقہ پیدا کرنا تھا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو۔ لیکن ذوق، فکر و نظر اور
اخلاق و حکمت و دانش کے اعتبار سے انگریز ہو[۱۹]۔

ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں، بقول رام گوپال جس طرح فارسی کو اختیار
کرلیا تھا اسی طرح انگریزی کو بھی بلا تامل قبول کرلیا۔ لیکن مسلمانوں کے لئے یہ فیصلہ

بڑے دوررس نتائج کا حامل تھا، انہوں نے خیال کیا، (یہ خیال کچھ ایسا غلط نہ تھا) کہ انگریزی تعلیم کو رائج کرنا مسلمانوں کی ثقافت کو ختم کرنے اور ان کے مذہب کو آلودہ کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔ چنانچہ وہ انگریزی زبان سے دور رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۸۱-۱۸۸۰ء میں جہاں انگریزی ہائی اسکولوں میں چھتیس ہزار چھ سو چھیاسی ہندو طلبہ زیر تعلیم تھے وہاں ان کے مقابلے میں مسلمان طلبہ کی تعداد صرف تین سو تریسٹھ تھی۔[۸]

مسلمانوں کی بربادی میں جو تھوڑی بہت کسر باقی تھی وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے پوری کر دی۔ مسلمان چونکہ اورنگ زیب سے لے کر ٹیپو سلطان تک، برابر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی وہ آگے آگے تھے اس لئے انگریزوں نے سارا غصہ انہیں پر اتارا۔ ملازمت، تجارت، تعلیم، صنعت و حرفت اور معاش کے سارے دروازے ان پر ایک ایک کر کے بند کر دئے گئے۔ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے، براہ راست تاج برطانیہ کا راج قائم ہو گیا۔ اب حکومت کی نئی حکمت عملی جن اصولوں کے تحت مرتب کی گئی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ذیل کے دو بیانات دیکھیے۔

گورنر جنرل لارڈ ڈالنبرا نے کہا:

> "میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھ نہیں بند کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے، اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرفدار بنائیں۔"[۹]

ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر نے لکھا:

> "مسلمانان ہندوستان، اب اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہے ہیں اپنے لئے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔"[۱۰]

یہ تھے مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کے وہ تصورات جن کو ذہن میں رکھ کر برطانوی سامراج نے ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر پر حکمرانی کی۔ ہندوؤں کو ہر طرح آگے بڑھایا گیا اور مسلمانوں کو دانستہ ہر شعبۂ حیات میں نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ ان کی زندگی ہر اعتبار سے ضیق میں کر دی گئی۔

نتیجتاً چند برسوں کے اندر ہی ہندوؤں کی ذہنیت میں کچھ ایسی تبدیلی آگئی اور ان میں حکومت کی شہہ پر کچھ ایسا احساس برتری رونما ہوا کہ وہ خود کو ایک ارفع و اعلیٰ قوم اور مسلمانوں کو ادنیٰ و حقیر خیال کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کے صرف دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں انہوں نے حکومت سے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی کو ناگری رسم الخط میں رواج دیا جانے۔ اس پر سرسید احمد خان نے جو اس سے پہلے تک ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے حامی تھے، تعجب و تاسف کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ اب ہندو اور مسلمان قومیں ہندوستان میں مل کر نہیں رہ سکتیں[۱۱]۔ یہیں سے دو قومی نظریے، قوم، قومیت، متحدہ قومیت، ہندو قومیت اور مسلم قومیت کے موضوعات و مسائل پر بحث کا آغاز ہوا۔

یہ بحث اردو ہندی کے مسئلے سے شروع ہوئی تھی اور آخر تک کسی نہ کسی طور پر اس سے منسلک رہی، وجہ یہ ہے کہ قوم اور قومیت کی تشکیل و تعمیر میں دوسرے عناصر کے ساتھ زبان نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خاص طور پر جمہوری نظام میں جہاں حکومت کا حق افرادی اکثریت رکھنے والی قوم کو حاصل ہوتا ہے، زبان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جمہوری نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جس قوم کے افراد کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہو، ان میں ایک طرح کی ذہنی، جذباتی اور ثقافتی یگانگت بھی پائی جاتی ہو۔ اس یگانگت کے بغیر جمہوری حکومت اور اس کے ادارے انتشار اور بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے عزائم اور فیصلے بے اثر اور ان کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں لیکن اس قسم کی قومی یگانگت جو آزادی اور آزاد مملکتوں کی ترقی کی ضمانت دے سکے، بالعموم قومی زبان سے پیدا ہوتی ہے۔ قوم، بغیر قومی زبان کے گونگی اور بے وقعت اور زبان، بغیر قوم کے غیر مؤثر و بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے بہت صحیح کہا ہے کہ:

"زبان اگرچہ مخلوق ہے یعنی انسان کے عمل و سعی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ خالق بھی ہے یعنی وہ خیالات کے پیدا کرنے اور سمجھانے میں بھی مدد دیتی ہے۔ جن کے پاس زبان نہیں ہے ان کے پاس خیال بھی نہیں۔ جن کی زبان محدود ہے ان کے خیالات بھی محدود ہیں۔ اسے معمولی چیز نہ سمجھنا چاہئے یہ ہماری معاشرت اور تمدن کے ہر شعبے کے رگ و پے میں پڑی ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنے تمدن و تہذیب کو

بچانا اور مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی زبان کو بچانا اور مضبوط کرنا لازم ہے۔ اگر ہم اپنے خیالات کو وسیع اور اعلی بنانا چاہتے ہیں تو زبان کو وسعت اور ترقی دینا ہمارا فرض ہے۔ یہ قدرت کی ان چند نعمتوں میں سے ہے جو زندگی کو خوشگوار اور برتر بنانے میں مدد دیتی ہیں۔[۱۲]

اس لئے انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں جیسے ہی برصغیر پاک و ہند میں آزادی اور مقامی خود مختاری کے آثار رونما ہونے لگے، قوم اور قومی زبان کے سوالات بھی خود بخود پیدا ہو گئے۔

۱۸۸۰ء میں لارڈ رپن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ انہوں نے ۱۸۸۲ء میں پہلی مرتبہ حکومت برطانیہ کی طرف سے اعلان کیا کہ۔ "ہندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے، رفتہ رفتہ حکومت کے کاموں میں شریک کئے جائیں گے اور مقامی خود مختاری کے اداروں میں انہیں نمائندگی دی جائے گی"[۱۳] ہندو چونکہ مسلمانوں کی بہ نسبت، اقتصادی، سیاسی اور تعلیمی ہر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ اور باشعور تھے اس لئے انہوں نے ۱۸۸۲ء کے اعلان سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت جلد یعنی ۱۸۸۵ء میں "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کے نام سے، انگریزوں کے اشارے پر، ایک سیاسی جماعت بنالی۔ "انڈین نیشنل کانگریس" میں لفظ "نیشنل" کی شمولیت کا مقصد ہندوؤں کے نزدیک پہلے ہی دن سے یہ تھا کہ مسلم قومیت کو کسی طرح ہندو قومیت میں ضم کر دیا جائے تاکہ کسی وقت اگر ہندوستان، جمہوری بنیادوں پر آزاد ہو تو ہندو ہی من حیثیت القوم اس کے حاکم و وارث قرار پائیں، اور مسلمان اقلیتی فرقے کے طور پر، ان کی محکومیت میں زندگی بسر کریں چنانچہ کانگریس نے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے اور "انڈین نیشنل کانگریس" سیاسی و ثقافتی، ہر قسم کے امور میں اس کی نمائندگی کرتی ہے۔

سرسید احمد خان نے اپنی غیر معمولی فراست اور تجربے کی بنا پر، کانگریس کی چال کو شروع ہی میں بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے مختلف موقعوں پر کھلے لفظوں یہ بات کہی کہ ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں بستی ہیں۔ بعد کو ممتاز مسلمان رہنماؤں نے بھی قومیت اور قوم کے بارے میں یہی موقف اختیار کیا۔ لیکن ہندوؤں نے اکثریتی قوت کے زعم اور اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ان کی رائے کی کوئی پروا نہیں کی اور قیام پاکستان کے چند روز پہلے تک کانگریس کے رہنما خود کو ہندو اور مسلمان دونوں کا نمائندہ کہتے رہے حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء میں، جبکہ ہندوستان کی آزادی کے دن بہت قریب آگئے تھے،

گاندھی جی نے قائداعظم کو ایک خط میں لکھا:

"ہماری گفتگو کے دوران میں آپ نے بڑی سرگرمی کے ساتھ دعویٰ پیش کیا ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں، یعنی ہندو اور مسلمان۔ اور یہ کہ اول الذکر کی طرح، موخرالذکر کے وطنی علاقے بھی ہندوستان میں واقع ہیں۔ یہ استدلال جس قدر آگے بڑھتا ہے اسی قدر آپ کی تصویر میرے لئے ترددانگیز بنتی جاتی ہے۔ اگر یہ تصویر حقیقی ہوتی تو بہت دلکش ہوتی لیکن میرا اندیشہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے کہ یہ تصویر قطعاً غیر حقیقی ہے اور مجھے تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اپنا مذہب تبدیل کرنے والی کسی جماعت اور اس کی بعد کی نسلوں نے اصل جمعیت سے الگ ایک قوم ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ اگر اسلام سے پہلے، ہندوستان ایک قوم تھا تو اس کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد کے مذہب تبدیل کرنے کے باوجود بھی اسے ایک ہی قوم رہنا چاہئے۔ ایک ہندوستانی مسلمان کو کسی دوسرے ہندوستانی سے ممتاز کرنے والی چیز، مذہب کے علاوہ اور کیا ہے، کیا وہ کسی ترک اور عرب سے مختلف ہوتا ہے"[۱۴]

گاندھی جی کے جواب میں قائداعظم نے لکھا:

"ہمارا دعویٰ ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور معیار کی رو سے مسلمان اور ہندو، دو بڑی قومیتیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے اور مزید برآں یہ کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنی خاص تہذیب و تمدن، زبان و ادب، فنون و تعمیرات، اسم اصطلاحات، رسم و رواج، نظام تقویم، تاریخ و روایات اور رجحانات و عزائم رکھتی ہے، اور زندگی کے متعلق ہم ایک ممتاز تصور رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں"[۱۵]

اس پس منظر میں برصغیر کی ہندو مسلم سیاست میں دو قومی نظریے کے اولین داعی سرسید احمد خان تھے۔ اور سرسید کی اس دعوت کا اولین محرک ہندی اردو کا وہ تنازع تھا جو ۱۸۵۷ء کے بعد ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور تکرار کا خاص موضوع بن گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ ہندوستان میں انگریزوں کے سیاسی تسلط کے بعد، ہندوؤں میں جیسے ہی اپنی قومیت کے احیا کی تحریک شروع ہوئی، انہیں اس قومیت کے لئے ایک

جداگانہ قومی زبان کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے انجمن حمایت اسلام، لاہور، ۱۹۴۱ء کے خطبہ صدارت میں صحیح کہا تھا کہ:

"ملک کی بد قسمتی کہ انگریزی تسلط کے بعد بعض اسباب کی بنا پر، جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں، ہندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی جس کی بنیاد قدیم تہذیب اور قدیم مذہب و زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کے لئے نئی زبان کی ضرورت داعی ہوئی کیونکہ قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے۔"[۲۶]

چنانچہ ہندوؤں نے یہ شوشہ چھوڑ کر کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی کو لا کھڑا کیا ورنہ اردو کو ایک مدت سے جیسا کہ زبان و ادب کے متعدد عالموں نے اعتراف و اظہار کیا ہے، برصغیر پاک و ہند میں لینگوا فرینکا کی حیثیت حاصل تھی اس کی پیدائش چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ کے نتیجے میں ہوئی تھی اس لئے ہزار اختلاف کے باوجود دونوں قوموں کے درمیان اردو ہی ارتباط و اتحاد باہمی کی سب سے اہم اور واضح نشانی خیال کی جاتی تھی۔ اس کی تعمیر و ارتقا میں ہندو، مسلمان اور دوسری علاقائی قومیتیں برابر کی شریک رہی ہیں اور عملاً آج بھی صورت حال یہی ہے۔ اس نئی زبان میں بقول ڈاکٹر تارا چند کچھ ایسی کشش تھی کہ وہ بہت جلد سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ صوفیائے کرام نے اس سے تبلیغ کا کام لے کر اور بھی مقبول بنا دیا، اٹھارویں صدی عیسوی تک اس نے ایسی ترقی کر لی کہ اس کی علمی و ادبی محفلیں ملک کے ہر صوبے اور ہر گوشے میں جم گئیں[۲۷]۔ اردو کی یہ مقبولیت اور ہردل عزیزی ان ہندوؤں کو بہت شاق گزری جنہوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں ہندو قومیت کی جارحانہ تحریکوں کو جنم دے کر "ہندوستان برائے ہندو" کا خواب دیکھا۔ اور اردو کے خلاف محاذ قائم کر کے، ہندو مسلم اتحاد و تہذیب کی اس عمارت ہی کو ڈھا دینے کی کوششیں شروع کر دیں جو صرف اردو زبان کی اساس پر قائم تھی[۲۸] پھر جیسے جیسے اردو ہندی کا تنازع بڑھتا گیا، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلاف کی خلیج بھی وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز تک، ہندو مسلمان، بھائیوں کی طرح مل جل کر رہ رہے تھے۔ مذہبی عقائد و رسوم اور تہذیب و تمدن کے بعض بنیادی اختلافات کے باوجود وہ نہ تو اپنی مذہبی و ثقافتی برتری ایک دوسرے پر ظاہر کرتے تھے اور نہ فرقہ وارانہ انداز میں ایک دوسرے سے نبرد آزما

ہوتے تھے۔ لیکن راجہ رام موہن رائے کی تحریک برہمو سماج، اور بنکم چندر چٹرجی کے ناول "آنند مٹھ" اور بعد ازاں اسی طرز کی دوسری تحریکوں اور تحریروں کے زیر اثر، ہندوؤں میں قومی احیا کی جو لہر پیدا ہوئی اس نے ان میں مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ شاندار ماضی کے وارث ہونے کا خیال مستحکم کر دیا۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار تک وہ خاموش رہے، لیکن جیسے ہی انگریز کے ہاتھوں مسلمان مغلوب ہوئے اور ان کی سماجی و سیاسی حیثیت میں ضعف آیا، ہندوؤں کو ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا ہر طرح موقع مل گیا۔[۱۹] چنانچہ ہر جگہ اور ہر موقع پر ہندو قومیت کا راگ الاپا گیا۔ مسلمانوں کی ثقافت کو حقیر اور ان کے عہد حکومت کو جابرانہ و ظالمانہ ٹھہرایا گیا۔ اردو کے مقابلے میں ایک نئی زبان ہندی کے نام سے سامنے لائی گئی اور اردو کو ہر اعتبار سے گردن زدنی قرار دیا گیا۔ ہندی کے پرچار کے لئے جا بے جا طریقے اختیار کئے گئے۔ جگہ جگہ سبھائیں اور انجمنیں قائم ہوئیں، اردو اور اردو والوں کو مردود و مطعون ٹھہرایا گیا۔ ہندوؤں کے اس رویّے نے آگے چل کر ہندی اردو تنازع کی صورت میں، ہندو مسلم سیاست میں ایسی اہمیت حاصل کر لی کہ ہندی، ہندوؤں کے لئے اور اردو مسلمانوں کے لئے ایک طاقتور قومی نشان (Symbol) بن گئی۔[۲۰] اردو کی بڑھتی ہوئی یہ مقبولیت بے سبب نہیں تھی۔ اردو اپنی ساخت میں ایک مخلوط زبان ہے[۲۱] یعنی اس کی اساس مختلف زبانوں کے الفاظ کے اختلاط پر قائم ہے۔ اس اساس کو ہندو اور مسلمانوں کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی ضرورتوں نے جنم دیا اور ان ہی دونوں کی باہمی کوشش سے اس نے ترقی کی راہیں طے کیں۔ لیکن اردو کو مخلوط زبان کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کی اور زبانیں خالص ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو خالص ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ بات یہ ہے کہ زبان بھی اپنے بولنے والوں کی طرح سماجی و سیاسی عوامل و محرکات کی تابع ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی زبان اپنے گرد و پیش یا سوسائٹی سے ناطہ توڑ کر بہت دنوں تک عملاً زندہ نہیں رہ سکتی، جس طرح کسی فرد یا قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بقا و ترقی کے لئے سماج اور دوسری قوموں سے اپنے روابط استوار رکھے بالکل اسی طرح زندہ رہنے والی زبانوں کے لئے لازم آتا ہے کہ دوسری زبانوں سے ان کا ربط و ضبط بڑھتا رہے۔ بغیر اس کے نہ کوئی فرد یا قوم، بین الاقوامی مسائل میں حصہ لے سکتی ہے اور نہ کوئی زبان بین الملکتی تبادلۂ خیال کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

زبانوں کے لئے ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ اس نقطہ نظر سے اردو، دنیا کی ساری زبانوں میں منفرد ہے۔ یہ اپنے وجود میں مختلف زبانوں کے مرکب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ اس کی بنیاد ہی مختلف زبانوں کے اشتراک پر رکھی گئی ہے۔ زبان کیا ہے اپنے ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے زبانوں کی ایک بین الاقوامی انجمن ہے۔ اس لئے کہ اس میں شرکت کے دروازے ہر زبان کے الفاظ پر ہر وقت کھلے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اردو میں ایک فقرہ بھی ایسا نہ ملے گا جس میں دو تین "زبانوں" کے الفاظ شامل نہ ہوں، خصوصاً عربی، فارسی، سنسکرت اور پاک وہند کی دوسری زبانوں مثلاً سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، برج بھاشا، راجستھانی کھڑی بولی وغیرہ کے الفاظ تو اتنی کثرت سے شامل ہیں کہ ان زبانوں سے تعلق رکھنے والا ہر شخص، اردو سے ایک طرح کی قربت محسوس کرتا ہے۔ اسی احساس قربت کے سبب، ہر علاقے کے لوگوں نے اسے اپنی زبان سمجھا، اس کی ترقی میں حصہ لیا اور پاک وہند کی لینگوا فرینکا قرار دیا۔ ممتاز فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی نے اپنے سالانہ خطبات و مقالات اور اپنی "تاریخ ادب ہندوستانی"[۲۲] کی مجلدات میں بار بار اس بات کا اظہار کیا ہے کہ:

"ہندوستان کی عام بولیوں میں ہندوستانی (اردو) سب سے زیادہ وسیع البیان اور لچکدار زبان ہے اور اس کا جاننا سب سے زیادہ سود مند ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں عموماً یہی زبان استعمال ہوتی ہے"[۲۳]

فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) کلکتہ میں ہندوستانی شعبے کے سربراہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے آج سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے لکھا ہے کہ:

"چونکہ ہندوستانی ہندوستان کی سب سے زیادہ عام زبان ہے اور جو ہمیں شب و روز اپنے دیسی افسروں، مدرسوں، ملازموں اور دیگر متعلقین سے گفتگو کرنے میں استعمال کرنی پڑتی ہے اس لئے بخوبی اصول کے ساتھ اسے جس قدر جلد سیکھا جائے اسی قدر بہتر ہے"[۲۴]

"جس طرح یورپ میں ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے بعض جدید و قدیم زبانوں کا علم مفید اور موجب زینت سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ہندوستان میں سنسکرت، فارسی، عربی وغیرہ کا علم بھی وہی درجہ رکھتا ہے، لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں ہر شخص کے لئے ہندوستانی جاننا ایسا ناگزیر ہے جیسا کہ انگلستان والوں کے لئے انگریزی کا جاننا اور

اسی لئے ان حضرات کا جو ایسٹ انڈیا کو آنا چاہتے ہیں سب سے ضروری اور بڑا وصف یہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ دیر یا سویر ان پر صاف کھل جائے گا کہ ہندوستانی (اردو) کے مقابلے میں یہ علمی زبانیں دوسرے درجے پر ہیں۔[۲۵]

اردو کی اس مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے بارے میں اسی طرح کا اظہار خیال، بہت سے ہندو، مسلمان اور یورپین مورخین اور ماہرین زبان نے کیا ہے۔ سبھی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اردو، ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بآسانی سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی چار سو سالہ زندگی میں مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں، مختلف ناموں سے پکاری گئی ہے۔ اول اول اس رعایت سے کہ اس نے ہندوستان میں جنم لیا اور ہندوستان کا علاقہ زمانہ قدیم میں ہند یا ہندو کہلاتا تھا اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز ہندی یا ہندوی کہلاتی تھی، اردو کو ہندی اور ہندوی کے نام سے پکارا گیا۔ چنانچہ مسعود سعد سلمان لاہوری، امیر خسرو اور کئی قدیم مصنفین کے یہاں یہی نام ملتا ہے۔ دکن میں اسے دکنی اور گجرات میں گوجری یا گجری کہا گیا ہے۔ دہلوی اور ریختہ بھی اس کے نام رہے ہیں۔ زبان ہندوستان یا ہندوستانی کے نام سے بھی اسے یاد کیا گیا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی کے قدیم اردو شاعر و مصنف ملا وجہی نے "سب رس" میں اسے زبان ہندوستان ہی کہا ہے لیکن "ہندوستانی" کا نام بالعموم انگریزوں کی آمد کے بعد ان کے زیر اثر مقبول ہوا ہے۔ بیشتر پرانے یورپین مستشرقین اور انگریز مصنفین نے اردو کو ہندوستانی ہی کا نام دیا ہے۔ ایک زمانے تک اردو کو "اردوئے معلیٰ" بھی کہا گیا ہے لیکن یہ سارے نام رفتہ رفتہ متروک ہو گئے صرف اردو رہ گیا۔[۲۶]

اردو کا لفظ اصلی ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ یعنی، اوردو، اوردہ، اردہ، اور، اورودو، جس کے معنی لشکر اور لشکر گاہ ہیں۔ یہ لفظ ترکوں کے ساتھ پاک و ہند میں داخل ہوا۔ تزک بابری میں یہ لفظ لشکر گاہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہوا یہ کہ دہلی کے جس علاقے یا بازار میں مغل فوجیوں نے شاہی کیمپ، یا چھاؤنی بنائی اس کا نام اردو بازار یعنی لشکر گاہ پڑ گیا۔ شاہجہاں نے اس اردو بازار کو اس کی اہمیت کے پیش نظر اردوئے معلیٰ کا خطاب دیا۔ اس اردوئے معلیٰ یا ذی مرتبت فوجی چھاؤنی میں جو نئی مخلوط زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ "زبان اردوئے معلیٰ" یا "زبان اردو" یعنی لشکری زبان کہلائی۔ میر تقی میر نے "نکات الشعراء" مرقومہ ۱۱۶۵ھ میں اسے ایک جگہ زبان

اردو نے معلی کہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس مرکب سے زبان کا لفظ محذوف ہوگیا اور اس اصول پر کہ زبان میں، کبھی جزو بول کر کل اور کل بول کر، جزو یا ظرف کی جگہ مظروف اور مظروف کی جگہ ظرف مراد لیتے ہیں، اردو کا لفظ بھی آپ نے اصل معنی چھوڑ کر ایک خاص زبان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور آج کل اردو کے سوا کوئی اور نام اس کے لئے مستعمل نہیں ہے[۲۷]

برجموہن دتاتریا کیفی نے اردو کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک اور بات کہی ہے ان کے بیان کے مطابق اردو کا لفظ اصلاً سنسکرت کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ لفظ دراصل "اُرداؤ" (URDAOO) ہے "اُر" کے معنی ہیں دل اور "داؤ" کے معنی ہیں دو۔ چونکہ یہ زبان ہندو مسلم تہذیب کے ملاپ سے وجود میں آئی اس لئے اس کا نام۔ ارداؤ۔ یعنی دو دلوں کو ملانے والا پڑ گیا۔ یہی "ارداو" بعد کو اردو بن گیا[۲۸]

"اردو" کی وجہ تسمیہ سے متعلق علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی کی تحقیق بھی قابل توجہ ہے ان کا خیال ہے کہ:

> "لفظ اردو (اڑدو) کو اپنی روزانہ بول چال میں ڈھیر یا بہت سی چیزوں کے جمع ہونے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ اس مفہوم میں سندھ میں عربوں کی آمد سے تین ہزار سال پہلے سے رائج ہے۔"
>
> "یہ لفظ بیک وقت اسکنڈے نیویا، فارس اور ہندوستان میں موجود پاتے ہیں اور یہی تین مقام آریوں کے خاص وطن ہیں۔ قدیم ناروی دیو مالا میں ہمیں لفظ، اردو، یا ارتھر ایک دیوی کے نام کی صورت میں ملتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند جرمانی زبان بولنے والی اقوام نے جب اپنا مشترکہ وطن چھوڑ کر مشرق و مغرب کا رخ کیا تو یہ لفظ مروج تھا اگر ہم اوستا کی زبان یا قدیم فارسی دیکھیں تو یہ لفظ وہاں بھی موجود ہے "شیر اُردو بیل اور بادشاہ، ارد شیر۔ کے نام اس دور میں اس لفظ کے مستعمل ہونے کے واضح ثبوت ہیں۔ یہ لفظ آج بھی سندھی اور جدید فارسی میں یکساں طور پر فوج، چھاؤنی اور بازار کے معنوں میں موجود اور مروج ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے معنی میں اجتماع، ڈھیر اور بھیڑ کا مفہوم مشترک ہے[۲۹]

اردو کا لفظ اصلاً ترکی ہو یا سنسکرت اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ خاص زبان کے

معنی میں یہ لفظ بدیسی نہیں ہے۔ دوسری مقامی زبانوں کی طرح اردو نے بھی ہندوستان و پاکستان ہی کے علاقوں میں جنم لیا ہے۔ یہیں پروان چڑھی ہے اور ہندو مسلم تہذیب کے اتصال کی یادگار ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کے لفظوں میں

"ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توطن گزینی کا نتیجہ ہے اور جوں جوں ان کی سلطنت اس ملک میں وسعت اختیار کرتی گئی یہ زبان بھی مختلف صوبوں میں پھیلتی گئی۔"[۳۰]

رہ گئی یہ بات کہ اردو نے کس خطے میں جنم لیا ہے اس کے بارے میں مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ "ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اردو زبان نے وہیں جنم لیا ہے۔ اس سے اردو کی مقبولیت و وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے"[۳۱]۔ اردو کی اس مقبولیت سے یہ قیاس کرنا کہ حکمرانوں یا مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی میں ایسا ہوا، درست نہ ہوگا۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ "یہ زبان کسی پر ٹھونسی نہیں گئی۔ نہ کسی علاقے پر عائد کی گئی، نہ اس کے بولنے اور لکھنے والوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا گیا اور نہ اسے قبول نہ کرنے والوں سے جواب طلب ہوا، بلکہ یہ سارا عمل نرم روی سے خود اختیاری طور پر ہوتا رہا۔ معاشی اور تمدنی ضروریات نے اسے تقویت پہنچائی اور عوام نے اسے توانائی بخشی"[۳۲]۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی ترویج و اشاعت میں مسلمان حکمرانوں نے براہ راست کوئی حصہ نہیں لیا۔ مسلمان جب فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے تو وہ اپنی مادری زبانیں یعنی عربی، فارسی اور ترکی ساتھ لائے تھے۔ لیکن حکومت کے ساتھ، استحکام صرف فارسی کو حاصل ہوا۔ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں وہی مروج رہی اور ہر قسم کی تحریر و تقریر میں اسی سے کام لیا جاتا رہا۔ البتہ معاشرتی اور کاروباری ضرورتوں کے تحت روزمرہ کی گفتگو میں، مسلمانوں کو دیسی الفاظ اور ہندوؤں کو فارسی الفاظ استعمال کرنے پڑتے تھے۔ زبانوں کے اس اختلاط اور عوامی تقاضوں کے نتیجے میں ایک گم نام اور بے نام بولی وجود میں آگئی اور تھوڑے ہی دنوں میں ایک شائستہ اور مستقل زبان بن گئی[۳۳]۔

اس نئی زبان میں شعر و شاعری کا سلسلہ، جیسا کہ امیر خسرو کی پہیلیوں اور دوسخنوں سے ظاہر ہے، تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر ہی سے شروع ہو گیا تھا، سترہویں صدی سے اس میں تصنیف و تالیف کا باقاعدہ کام ہونے لگا۔ نثر و نظم دونوں میں ہر قسم کے موضوعات پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج نے اپنے چھاپے خانے کا بھی انتظام کیا اور عربی، فارسی اور سنسکرت کے ساتھ کالج میں

اردو زبان کا شعبہ بھی بطور خاص کھولا گیا، بہت سی کتابیں لکھوائی گئیں اور دوسری زبانوں سے ترجمہ کروائی گئیں حتیٰ کہ ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اردو کو دفتری اور عدالتی زبان بنا دیا گیا۔ اسی دوران میں دلی کالج میں، سارے مضامین (بشمول ریاضی اور سائنس) کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دے دیا گیا، ان اقدامات نے اردو کی ترقی و مقبولیت کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ اس سارے عمل میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک رہے دونوں نے اسے اپنی زبان سمجھا۔ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ:

> Urdu, however, was regarded by both Hindus and Mussalmans of the 18th Century as their Lingua- franca. Bhartendo Harishandra, one of the pioneers of Modern Hindi, acknowledged in the middle of the 19th century that Urdu was the language of polite speech in the North even among the members of his community (Agarwals). So when the East India Company ordered the establishment of the Fort William College in Calcutta to teach Indian languages to their officers, Urdu was the language for which teachers were appointed, as also for the calssicial languages, Arabic, Persian and Sanskrit and provincial languages like Bengali and Brajbhasha. [۳۴]

اردو کی اس مقبولیت اور علمی ترقی سے قطع نظر جیسا کہ پچھلی سطور میں بھی جا بجا اشارے آ چکے ہیں، لسانی نقطہ نظر سے بھی وہ پاک و ہند کی سرزمین ہی میں پیدا ہوئی ہے اور آریائی زبانوں کے اس خاندان سے تعلق رکھتی ہے جسے آریائی یا ہند یورپی خاندان کہا جاتا ہے اور جس کے موٹے موٹے اصول وہی ہیں جو دوسری آریائی زبانوں کے ہیں۔ مولوی وحید الدین سلیم نے آریائی خاندان کی زبانوں کے مشترک اصولوں پر تفصیل سے بحث کی ہے[۳۵] برجموہن دتاتریا کیفی نے بھی بعض مشترک اصولوں کی نشاندھی کی ہے[۳۶] راقم الحروف نے بھی اس موضوع پر بعض خیالات پیش کئے ہیں[۳۷]۔ اردو کے مقامی زبان ہونے اور آریائی زبانوں سے اس کے تعلق کے سلسلے میں مشہور ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کا تو یہاں تک خیال ہے کہ:

> "اگر مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات نہ حاصل کی ہوتیں تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں بنتیں لیکن انہیں جو باوقار ادبی حیثیت حاصل ہو گئی اس میں ضرور دیر ہوتی۔ اس طرح اردو کے لئے زمین ہموار ہو گئی جس کا رشتہ براہ راست سنسکرت سے نہیں بلکہ اب بھرنش اور بول چال کی شور سینی پراکرت سے ہوتا ہوا اس آریائی ماخذ تک پہنچ جاتا ہے

جس نے خود ویدک سنسکرت اور سنسکرت کو جنم دیا۔[38]

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اردو اپنی اصل نسل کے اعتبار سے یکسر ہندوستانی ہے وہ شور سینی پراکرت سے ماخوذ ہے اور اس کے اصول و قواعد اور محاورے بالکل وہی ہیں جو دوسری ہند آریائی زبانوں کے۔"[39]

"ہندی" کا لفظ ایک جداگانہ زبان کے معنوں میں دراصل فورٹ ولیم کالج، کلکتہ (۱۸۰۰ء) کے ارباب حل و عقد کے منشا و اثر سے مستعمل ہوا۔ اس کالج میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی سربراہی میں مشرقی زبانوں یعنی عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو کی تعلیم و تدریس کا جو شعبہ قائم کیا گیا اس میں نصابی ضرورت کے لئے مختلف زبانوں کی منتخب کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی گئیں۔[40] مترجمین و مولفین میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے اور خود گلکرائسٹ کو اس کام سے بہت دلچسپی تھی۔ مسلمان مترجمین میں میر امن، سید حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، کاظم علی جوان، مظہر علی ولا اور ہندوؤں میں نہال چند لاہوری، منشی بینی نرائن جہاں اور للولال جی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ چونکہ تراجم کا بنیادی مقصد انگلستان کے نووارد انگریزوں کو اردو سکھانا تھا۔ اس لئے گلکرائسٹ کی ہدایت پر آسان سے آسان اردو میں ترجمے کئے گئے۔ میر امّن کی مشہور کتاب "باغ و بہار" کو ان تراجم کا معیاری نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ نہال چند لاہوری اور بینی نرائن جہاں کے اردو ترجمے بھی کم و بیش "باغ و بہار" ہی کے معیار کے ہیں، لیکن گجراتی برہمن للولال جی نے جو ترجمے کئے ان کی نوعیت دوسرے ترجموں سے بالکل مختلف ہے للولال جی نے "پریم ساگر" کے نام سے "بھگوت گیتا" کے ایک حصے کا ترجمہ کیا اور اسے اردو یعنی فارسی رسم الخط کے بجائے دیوناگری میں مرتب کیا۔ پریم ساگر کے علاوہ، انہوں نے بعض دوسری کتابیں مثلاً "سبھا بلاس" "راج نیتی" "لطائف ہندی" اور "سنگھاسن بتیسی" کے نام سے بھی مرتب کیں۔ ان کتابوں میں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں پہلی دفعہ یہ اہتمام کیا گیا کہ عربی و فارسی کے مروجہ الفاظ سے گریز کر کے دانستہ برج بھاشا اور سنسکرت الفاظ کو جگہ دی گئی، اور فارسی کے بجائے ناگری رسم الخط میں اشاعت کا انتظام کیا گیا۔ بعض کتابیں، مثلاً "سنگھاسن بتیسی" اگرچہ فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط میں چھاپی گئیں، پھر بھی اس کی زبان پر برج بھاشا اور سنسکرت کا غلبہ رہا۔ یہ کتابیں ہندوؤں میں بطور خاص مقبول ہوئیں، ہر طرف سے ان کتابوں اور ان کے مرتب کی

آڈ بھگت ہوئی، صرف اس لئے کہ ان کے ذریعے اردو سے الگ، ہندی کے نام سے ایک نئی زبان کے رواج اور اس رواج کے ذریعے ہندو قومیت کے فروغ کی ایک صورت پیدا ہوئی تھی۔ خود انگریزوں نے للولال جی کے اقدامات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ "پریم ساگر" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں چھپا تھا، بعد ازاں اس کے درجنوں ایڈیشن نکلے۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۶۷ء میں ان کے انگریزی ترجمے بھی شائع ہوئے[۴۱]

ایک خاص زبان کے معنی میں ہندی کا لفظ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور "پریم ساگر" جیسی کتابوں کی اشاعت کے بعد سننے میں آیا۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں کہ:

"جدید ہندی اس وقت تک نامعلوم تھی، کیونکہ اس کا کوئی لٹریچر موجود نہ تھا۔ ادبی مقاصد کے لئے اس کا استعمال فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ کالج کے پروفیسروں نے للولال جی اور دوسرے اساتذہ کی ہمت افزائی کی کہ وہ تصنیف و تالیف کا کام اسی زبان میں کریں جس میں اردو کے مصنفین کرتے ہیں، لیکن عربی و فارسی کے الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کریں، اس طرح ایک نئے اسلوب نے جنم لیا اور ہندوؤں نے اسے اپنی خاص ضرورتوں کے عین مطابق خیال کیا۔ عیسائی تبلیغی جماعتوں نے اس میں انجیل کا ترجمہ کر کے اور بھی اہمیت بڑھا دی۔ لیکن اس نئے اسلوب کو جسے جدید ہندی کہنا چاہئے، مقبول ہونے میں بڑی دیر لگی۔ حقیقتاً یہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا کہ ہندی کی طرف لوگوں نے توجہ کرنی شروع کی۔ اس کو مستحکم کرنے کے لئے خاص کوششیں کی گئیں۔ بیمز (BEAMS) کیلاگ (KELLOG) اور بعض دوسروں نے اسی زمانے میں اس کی قواعدیں لکھیں، حتیٰ کہ صوبائی حکومتوں نے بھی لوگوں کو اردو کے استعمال سے روک دیا[۴۲]"

ڈاکٹر تاراچند کی رائے بہت صحیح ہے، فورٹ ولیم کالج سے قبل ہندی کا لفظ خاص نہیں، عام تھا یعنی اس کا اطلاق، برج بھاشا اور راجستھانی، بندیلی اور اردو وغیرہ پر ہوتا تھا، اور اسی بنا پر اردو بھی ایک زمانے میں ہندی کہلاتی تھی، مگر وہ ہندی جس نے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا، اس کی پیدائش بہت بعد کو ہوئی ہے۔ بقول مولوی عبدالحق:

"فورٹ ولیم کے منشیوں نے بیٹھے بٹھائے بلاوجہ اور بغیر ضرورت یہ شوشہ چھوڑا۔ للولال جی نے، جو اردو کے زبان دان اور اردو کتابوں کے مصنف بھی تھے، اس کی بنا ڈالی، وہ اس طرح کہ اردو کی بعض کتابیں لے کر انہوں نے ان میں سے عربی فارسی لفظ چن چن کر الگ نکال دئے اور ان کی جگہ سنسکرت کے نامانوس الفاظ جما دئے اس طرح ہندی بن گئی، جدید ہندی سے جو لوگ واقف ہیں وہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے"[۴۳]

کچھ عرصے کے بعد جب اسی ہندی کو ہندو قومیت کی علامت بنا کر ابھارا گیا تو وہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کا سبب بن گئی۔ وجہ یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی معرفت جس طرح جدید ہندی، وجود میں آئی تھی وہ کوئی فطری یا لسانی ارتقا کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک سیاسی حربہ تھا اور ہندوستان کے سارے باشندوں کو ایک قومی نظریے یا ہندو قومیت کے جال میں پھنسانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ یہ منصوبہ دراصل مسلمانوں کے خلاف تیار کیا گیا تھا۔ اور اس میں بعض وجوہ سے ہندوؤں کے ساتھ انگریز بھی برابر کے شریک تھے۔ بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ہندوؤں نے انگریزوں کی سرپرستی میں اور انہی کے اشارے پر ہندی کا شاخسانہ پیدا کیا تھا۔ اس کا ثبوت مشہور زمانہ ماہر لسانیات گریرسن کے ان الفاظ سے ملتا ہے:

"بدقسمتی سے، اس زمانے میں، انگریزوں کا طاقتور اثر و رسوخ سنسکرت والوں کی طرف تھا۔ یہ سنسکرت آمیز ہندی بالعموم عیسائی مبلغین استعمال کرتے تھے اور انجیل کے ترجمے بھی اسی میں لکھے گئے تھے"[۴۴]

اس جگہ ایک اور مغالطے کو دور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض ہندو مصنفین موجودہ ہندی کی قدامت ثابت کرنے کے لئے اس کا رشتہ، برج بھاشا سے جوڑ دیتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ برج بھاشا جیسا کہ خود للولال جی کی کتابوں سے ظاہر ہے، اردو اور ہندی سے الگ ایک زبان تھی۔ اردو نے، اور بعد کو موجودہ ہندی نے یقیناً اس سے اثر قبول کیا ہے، لیکن برج بھاشا کی ادبی قدامت بھی دہلی میں مسلمانوں کے قدم جمانے یعنی ۱۱۹۲ء سے آگے نہیں بڑھتی۔ علاوہ ازیں برج بھاشا کا ادبی دائرہ صرف شاعری تک محدود تھا۔ یہ

شاعری بھی، جس کی تاریخ میں سور داس، کبیر داس، ملک محمد جائسی، تلسی داس، عبدالرحیم خانخاناں اور بھوشن وغیرہ کے نام ملتے ہیں، مسلمان حکمرانوں کے عہد میں پروان چڑھی تھی[۴۵]۔ برج میں نثری ادب اس وقت تک ناپید تھا اس لئے جدید ہندی نثر کا ناطہ، قدیم برج بھاشا سے جوڑنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ ہندی اور اس کی نثر نے انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جنم لیا ہے اور اس کی ترویج و ترقی میں ہندو اور انگریز ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی سازش کے طور پر، برابر کے شریک رہے ہیں۔ تاراچند نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

At Fort William College, Calcutta, which was established to teach British Officers, Indian Languages, besides other subjects, a number of them were taken up for study. Among them were Braj + Urdu. Braj, as has been indicated above was the language of poetry and did not lend itself readily for the purposes of prose. Urdu, which was studied by both Hindus and Muslims, was naturally selected as the common language of India. Unfortunately the Zeal of finding distincations led the professors of the college to encourage attempts to create a new type of Urdu from which all persian and Arabic words were removed and replaced by Sanskrit word. This was done ostensibly to provide the Hindus with a language of their own. But the step had far - reaching consequences and India is still suffering from this artificial bifurcation of tongues. [۴۶]

جے۔ داس گپتا نے ہندستان کے موجودہ لسانی و قومی مسائل پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب کے ایک باب میں بطور پس منظر، تقسیم ہند سے پہلے کے لسانی اختلافات یعنی اردو ہندی تنازع سے بھی بحث کی ہے، اس میں انہوں نے ہندی کی قدامت ثابت کرنے کے لئے اگرچہ، برج بھاشا اور اردو کے سارے ادب کو بھی ہندی ہی میں شمار کرلیا ہے، تاہم موجودہ یا جدید ہندی کے بارے میں انھیں بھی اعتراف ہے کہ وہ مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے عروج کے ساتھ ساتھ وجود میں آئی ہے، اور اردو ہندی کے تنازع وہیں سے پیدا ہوا ہے۔ خود انہیں کے لفظوں میں:

The decline of Muslim rule in India and the advent of British rule we accompanied by a corresponding decline of persian. During the early years of the foundation of Brithish rule, Dr. J. B. Gilchrist of fort William at Calcutta engaged a group of writers to write Hindustani prose. This form of prose was channelled into two distinctly different styles: Hindi,

purged as far as possible of persian words and Urdu, remaining as close as possible to persianized style. From this time onward, the difference between Hindi and Urdu became increasingly sharper.[۴۷]

پنڈت کرشن پرشاد کول کے مطابق:

"انھارویں صدی کے آخر میں حکومت کی مصلحتوں نے فورٹ ولیم کالج میں پہلے پہل نئی ہندی کی بنیاد اس طرح ڈلوائی کہ للولال جی سے "پریم ساگر" ایسی ہندی زبان میں لکھوائی جس کا تعلق اردو ہی سے تھا نہ برج بھاشا سے، بلکہ کھڑی بولی اور ہندوستانی سے تھا۔ فرق یوں پیدا کیا گیا کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے داخل کئے گئے اور یہ قرار دیا گیا کہ جس زبان میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے ہوں وہ اردو ہے اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ بنیاد تو نئی ہندی کی اس طرح پڑ گئی لیکن بہت عرصے تک یہ پنپی نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس نئی ہندی میں کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں، اور جوں جوں ہندو اور مسلمانوں میں قومی اور سیاسی اختلاف بڑھتا گیا، نئی ہندی اسی جوش میں ابھرتی گئی۔ فارسی اور عربی کے وہ الفاظ جو زبان کے روزمرہ میں داخل ہو گئے تھے نکالے جانے لگے، اور ان کی جگہ سنسکرت کے بھاری بھاری الفاظ داخل کئے جانے لگے۔"[۴۸]

پنڈت کرشن پرشاد کول کا بیان درست ہے، لیکن یہ کہنا کہ جوں جوں ہندو اور مسلمانوں میں سیاسی اختلاف بڑھتا گیا، ہندی والوں کا جوش بھی بڑھتا گیا، زیادہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ جیسے جیسے ہندوؤں میں نئی قومیت کے جوش میں ہندی کا جوش بڑھتا گیا۔ ویسے ویسے ہندو اور مسلمانوں میں سیاسی اختلاف بھی بڑھتا گیا، مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

"انگریزی تسلط کے بعد، بعض اسباب کی بنا پر ھندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی، جس کی بنیاد قدیم تہذیب اور قدیم مذہب اور زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کا رشتہ زبان کی ضرورت داعی ہوئی کیونکہ قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے۔ اب انہوں نے ان علاقوں میں جہاں ہندی بولیاں رائج تھیں ایک مصنوعی ہندی کو داخل کرنا شروع کیا، اور اردو کو وہاں سے نکالنا شروع کیا۔ اس چیز نے ہندو مسلم اتحاد میں ہمیشہ کے لئے رخنہ ڈال دیا اور دنوں کا نقطہ نظر ایسا بدلا کہ ہندو مسلمان پھر کبھی کسی مسئلے پر متفق نہ ہو سکے۔"[۴۹]

اوپر کے مباحث کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ موجودہ ہندی، کوئی قدیم زبان نہیں ہے، اس کو جنم دینے اور اس کی کی تبلیغ و ترقی کا کام، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے شروع ہوا، اور پھر یہ کام انگریزوں کی تعلیمی ولسانی پالیسیوں (جن کی بنا بہرحال سیاسی مقاصد پر رکھی جاتی تھی) کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں جب فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا، اور ۱۸۳۹ء میں جب صدر عدالت دیوانی اور نظامت میں بھی اسے سرکاری حثیت حاصل ہوگئی، تو بظاہر انگریزی حکومت کا یہ اقدام اردو کے حق میں تھا، لیکن اس تبدیلی سے انگریزوں کی نظر بڑے دوررس نتائج پر تھی، اور یہ نتائج سراسر حکومت کے مفاد میں تھے۔ فارسی کو ختم کرکے انگریزوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس مضبوط و قدیم ثقافتی رشتے کو کاٹ دیا جس میں ہندوستان کے سارے مسلمان، خواہ وہ کسی صوبے اور علاقے کا رہنے والے ہوں، بندھے ہوئے تھے، اور جو مسلمانوں کے حق میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور علمی وادبی ہر لحاظ سے، زیادہ مفید و کارآمد تھا۔

اردو کی مقبولیت اور جامعیت کے سبب، اسے کچھ عرصے کے لئے انگریزوں نے فارسی کی جگہ رائج تو کر دیا، لیکن اس تبدیلی سے انھیں دھرا فائدہ پہنچا۔ ایک تو یہ کہ انہیں مسلمانوں کی ثقافتی وسماجی شیرازہ بندی کو کمزور کرنے میں آسانی ہوگئی، دوسرے یہ کہ عوام سے رابطہ قائم کرنے اور اس طرح اپنی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا انھیں موقع مل گیا۔ علاوہ ازیں ۱۸۳۷ء اور ۱۸۳۹ء میں فارسی کی جگہ اردو کو رواج دینے کے سلسلے میں جو احکامات جاری کئے گئے تھے، ان میں ایسی شقیں بھی موجود تھیں جن کی آڑ لے کر، انگریز اپنے مقبوضہ علاقوں میں کسی بھی دیسی زبان کو رائج کر سکتے تھے۔[5] چنانچہ یہی کیا گیا۔

۱۷۵۷ء سے کر ۱۸۵۷ء تک ت سو سال میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں وہ بالعموم مسلمانوں کے خلاف اور ہندوؤں کے موافق تھیں۔ خصوصاً ٹیپو سلطان کی شہادت ۱۷۹۹ء سے بہادر شاہ کی گرفتاری ۱۸۵۷ء تک کے درمیانی پچاس سال میں جو کچھ ہوا وہ مسلمانوں کی سیاسی وسماجی اور اقتصادی و تہذیبی زندگی پر ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ہے، یوں کہنا چاہئے کہ انیسویں صدی کی ابتدائی تھے سات دھائیوں کا زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش وابتلا کا زمانہ تھا۔

برطانوی اقتدار سے پہلے تک ہندوستان کی سیاسی وسماجی زندگی جیسی کچھ بھی

تھی اس میں بہرحال ایک طرح کا ٹھہراؤ اور ایک طرح کی وحدت قائم تھی۔ مختلف فرقوں نے جو اس ملک میں بستے آتے تھے۔ رہنے سہنے کا ایک مشترکہ طریقہ مرتب کر لیا تھا۔ اس میں ہر شخص دوسرے کے سہارے کا محتاج تھا۔ ہر ذات بلکہ ہر جماعت اپنے پیشہ میں لگی رہتی تھی۔ بایں ہمہ ہر جماعت پورے معاشرے کا ایک اہم جُزو تھی۔ پیشوں کے اختلاف کے سبب وُہ مقابلے یا مجادلے سے بچتے تھے اور سماجی ڈھانچے کے تعمیری پروگراموں میں مذہب کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرتا تھا لیکن برطانوی تسلط نے اس وحدت اور اس ڈھانچے کو توڑ دیا۔ لوگ ایک دوسرے سے الگ اور دور ہونے لگے۔ ان کے درمیان مغائرت اور طبقاتی فاصلے پیدا ہونے لگے۔ یہ مغائرت اور دوری دراصل برطانوی حکمرانوں کی اس سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا جو انہوں نے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے اصول کو سامنے رکھ کر اپنایا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کی خارجہ حکمت عملی کے ذمہ دار رکن سر جان مینرڈ (Sir John Mynard) کا قول ہے کہ:

"یہ یقیناً صحیح ہے کہ برطانوی اقتدار نہ تو قائم ہو سکتا تھا اور نہ آج ہی برقرار رہ سکتا ہے اگر وہ انتشاری میلان جس کا ایک مظہر ہندو مسلم مخالفت ہے، یہاں نہ پایا جاتا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو مسلم عوام کی رقابت کی ابتداء، برطانوی دور حکومت سے ہوئی ہے۔"[۵۱]

لیکن، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو تفرقہ انگریزوں نے پیدا کیا، اس سے ہندوؤں کو نہیں، سارا نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ وجہ یہ تھی کہ اس تفرقے کی بنیاد ہی، مسلمان کے مقابلے میں ہندوؤں کو مجتمع کرنے، اقتصادی طور پر ان کو طاقتور بنانے اور ان کے تمدن کو ممتاز ترین و قدیم تر ثابت کرنے، نظم و نسق میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرنے اور اس طرح کی بہت سی حوصلہ افزا مراعات پر قائم تھی چنانچہ ہندوؤں نے ہر موقع پر انگریزوں کی اس حکمت عملی سے پورا فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے خلاف، انگریزوں کو ہر سازش میں شامل ہو کر انہیں نقصان پہنچایا۔

انگریزوں اور ہندوؤں کے اس ملاپ اور گٹھ جوڑ کا بھی خاص سبب تھا۔ انگریز اپنے سیاسی تسلط اور اس کے استحکام کے سلسلے میں جتنا خوف زدہ اور چوکنا مسلمان کی طرف سے تھے ہندوؤں کی طرف سے نہ تھے۔ انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ عہد اکبری ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء کے آخری زمانے میں ہندوستان میں قدم رکھا تھا۔ مغلوں کے اقتدار اور دبدبے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مسلمان کی شجاعت و جان بازی سے بھی ان کا براہ

راست ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ وہ عملاً اس تجربے سے گذر چکے تھے کہ ان کے سیاسی تسلط کی راہ میں جتنی رکاوٹیں مسلمانوں نے ڈالی تھیں اور جس بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں ان کی سیاسی حکمت عملی کا پہلا اصول یہ تھا کہ مسلمانوں کو جسقدر کمزور بنایا جا سکتا ہے بنایا جائے اس کے برعکس، ہندوؤں کو ہر قسم کی مراعات دے کر، اپنا حلیف اور مسلمانوں کا حریف بنا دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندستان کا اصل سیاسی اقتدار، ہندوؤں سے نہیں مسلمانوں سے چھینا تھا۔ انہیں ہندوستان میں قدم جمانے کے لئے سب سے پہلے مسلمانوں ہی سے لڑنا پڑا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی ان کا اصل معرکہ، مسلمانوں ہی کے ساتھ ہوا تھا۔ چنانچہ ان مزاحمتوں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ ان کے اصل دشمن، ہندو نہیں مسلمان ہیں اس لئے جب تک مسلمانوں کو پوری طرح قابو نہ کر لیا جائے وہ اطمینان سے حکومت نہیں کر سکتے۔ ۱۸۴۳ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ النبرا نے اس سلسلے میں صاف صاف لکھا ہے کہ:

> میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے اس لئے ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرفدار بنائیں۔[۵۲]

برطانوی فوج کے ایک اعلیٰ افسر نے، ڈیوک آف ولنگٹن (Duck of Willington) کو خط میں لکھا تھا:

> "مجھے یقین ہے کہ جو لوگ (مسلمان) ہماری نگرانی میں رہ رہے ہیں وہ ہمارے بہی خواہ نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندو ہماری کامیابیوں پر بہت خوش ہیں۔ جب ہمیں مسلمانوں کی دشمنی کا جن کی افرادی طاقت آبادی کے دسویں حصے کے برابر ہے یقین ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کے اس نو بٹا دس حصے کی جو ہمارا خیر خواہ اور وفادار ہے، ہم دل کھول کر کیوں مدد نہ کریں۔[۵۳]

انگریزوں کی یہ مسلمان دشمن حکمت عملی پوری انیسویں صدی میں جاری و ساری رہی ولیم ہنٹر، اپنی کتاب مرقومہ ۱۸۷۰ء میں لکھا ہے کہ:

> "مسلمانان ہندوستان، اب بھی اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی

ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ رہے اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے۔ اپنے لئے بہت بڑی توہی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔[۵۴]

چنانچہ ہمیشہ اور ہر موقع پر انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے اور بعض کو اس کا اعتراف بھی تھا کہ عزم، تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور ان کے سامنے نسبتاً طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔[۵۵]

اس کے باوجود عدم توجہ اور ظلم کا نشانہ، مسلمانوں ہی کو بنایا گیا۔ ہندوؤں کو طرح طرح سے مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔ ایسی تاریخیں لکھی اور لکھوائی گئیں جن میں، مسلمانوں کے عہد حکومت کو ہندوؤں کے حق میں عذاب ظاہر کیا گیا۔ مثلاً اس زمانے کے ایک انگریز مورخ سر ہنری ایلیٹ (SIR HENRY ELLIOT) کا ذکر کافی ہوگا۔ سر ہنری ایلیٹ، ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ آخر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سکریٹری ہوگئے تھے، انہوں نے کئی جلدوں میں برصغیر کی تاریخ مرتب کی۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی۔ اس تاریخ میں موصوف نے من گھڑت واقعات کے ذریعے مسلمانوں سے ہندوؤں کو جس طرح متنفر کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔[۵۶]

انگریزوں کی اس مسلمان دشمنی کا ثبوت بعد کے واقعات سے بھی ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں شریک تھے لیکن انگریزوں نے سارا غصہ مسلمانوں پر اتارا، انہیں بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرا کر ہر طرح کچلنے کی کوشش کی، صرف اس لئے کہ انہیں ہندوستان پر دوبارہ قابض ہو جانے کا جو خطرہ مسلمانوں کی طرف سے تھا وہ سکھوں یا مرہٹوں سے نہیں تھا۔[۵۷] سر سید احمد خاں نے صحیح کہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ابتداء اگرچہ ہندوؤں کی جانب سے ہوئی لیکن مسلمان اس آگ میں کود پڑے اور ہندو گنگا نہا کر الگ ہوگئے۔ سارا نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔

ابھی حال میں سر سید احمد خاں کی سیاسی زندگی پر ایک کتاب چھپی ہے۔ اس میں

سر سید احمد خاں کو انگریزوں کا خوشامدی اور ان کی قومی تحریک کو کم رتبہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، صرف اس لئے کہ سر سید احمد خاں نے کانگریس کی پرزور اور برملا مخالفت کی تھی اس وقت یہ مخالفت، انگریزوں کی ناراضگی مول لینے کے مترادف تھی[۴۸]۔ وجہ یہ ہے کہ خود کانگریس ابتدا میں حکومت کی منظور جماعت تھی اور حکومت ہی کے اشارے اور ارکان کی مدد سے وجود میں آئی تھی۔ بایں ہمہ، اس کتاب میں بعض حقائق کا اعتراف کیا گیا ہے، شاید اس لئے کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا چنانچہ ڈاکٹر اشوک مہتہ اور بعض دوسروں کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ:

> The Mutiny was not a rebellion of one community, it was a rebellion joined by Hindus and Muslims alike, and both had in view the restoration of the Mughals and the deliverance of the country from the British. But the Muslims for historical and ideological reasons, were more violently anti-British than the Hindus. Therefore after the collapse of the Mutiny, the heavy hands of the Britis h fell upon Muslims and the repression of the Muslim was so ruthless and callous, that even the British authorities could not fail to confess it then vindictive policy of the Britisht was now so ruthlessly carried out that the proud Muslims were reduced to great straits, with their heart broken in despondency and their pride humbled in the dust. The sufferings were tremendous. Their property was totally confiscated and nothing was left with them. The aristocrats deprived of all fief, possession and influence, appeared to be moving corpses. The Hindus were permitted to return to Dehli within a few months after the reoccupation of Delhi, but the Mohammadan population was not allowed to come back till 1859.[۴۹]

جہاں تک اردو کے خلاف ہندی کی تحریک کا تعلق ہے، پہلے پہل بنارس کے ہندوؤں کی طرف سے یہ تحریک اٹھائی گئی اور یہیں اس کا پہلا مرکز قائم ہوا۔ سر سید احمد خاں اس زمانے میں بنارس ہی میں تھے اور پڑھے لکھے ہندوؤں نے اردو کے خلاف جو شورش بپا کر رکھی تھی وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلاف پیدا ہو گئے وہ ماضی قریب کے سیاسی و اقتصادی حالات کے تغیر کا نتیجہ ہیں جیسے ہی حالات معمول پر آئیں گے دونوں قومیں، پہلے کی طرح پھر ایک ہو جائیں گی۔ لیکن جب ہندوؤں کی طرف سے ایک جانی بوجھی سیاسی چال کے تحت، اردو کو ہٹا کر ہندی کو سرکاری کرسی پر بٹھانے کی کوششیں شروع ہوئیں

اور ان کوششوں نے ہر طرف زور پکڑا تو ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے وہ بھی مایوس ہوگئے۔ ان کو یقین ہوگیا کہ اب وہ ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے اور ان میں یگانگت و اشتراک عمل کی وہ صورت زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکتی جو ایک مدت سے چلی آرہی تھی۔ چنانچہ سرسید کے سوانح نگار و رفیق کار اور حد درجہ معتبر و ثقہ راوی مولانا الطاف حسین حالی نے، اس سلسلے میں سرسید کا ایک قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سنہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے"

سرسید کہتے تھے "یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے: "انہیں دنوں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کررہا تھا اور وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ سکیں گی ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔ انہوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اس پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"[۲۶]

سرسید احمد خاں نے یہ بات ہندوؤں کے ساتھ رہ کر برسوں کام کرنے، ان کی سیاسی اور لسانی سرگرمیوں کے گہرے مشاہدے، اور ذاتی تجربے کی بنا پر کہی تھی۔ اردو کی مخالفت، جیسا کہ خود سرسید احمد خان اور حالی نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ عام ہندو کی طرف سے نہیں بلکہ اس خاص طبقے کی طرف سے کی جارہی تھی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب،

اردو کی مقبولیت، اس کی ھمہ گیری اور تہذیبی قوت سے خوب واقف تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اردو کے مقابلے میں ہندی، کم سن و کم سوا ہے۔ اس کے باوجود اکثریت کے زعم اور حکومت کی شہہ پر، وہ ہندی کو عدالتی اور سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے۔ ہندی کے حامی اس خاص طبقے میں سرسید کے وہ ہندو احباب بھی شامل تھے جو روشن خیال کہلاتے تھے۔ صبح و شام سرسید کے ساتھ رہتے تھے۔ اور ان کی بنا کردہ رفاہی انجمنوں کے سرگرم رکن تھے۔ چنانچہ اردو کی مخالفت میں پہلا پتھر، سرسید احمد خاں کے ایک رفیق کار بابو شیو پرشاد کی طرف سے پھینکا گیا۔ بابو شیو پرشاد، سرسید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی کے ایک معتبر ممبر تھے۔ انہی نے سب سے پہلے اس بات کا مطالبہ کیا کہ سائنٹفک سوسائٹی کے اجلاسوں کی روندادیں اور کاروائیاں، ہندی میں شائع کی جائیں، نیز ہندی کے فروغ کے لئے سوسائٹی کی جانب سے ایک رسالہ جاری کیا جائے، پھر انہی کی کوششوں اور انہی کے منشاء سے، ہندی کے رواج کے لئے متعدد عرضداشتیں حکومت کو بھیجی گئیں۔[۶۱]

بابو شیو پرشاد، کئی زبانوں میں لکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ۱۸۵۴ء کے تعلیمی مراسلے (Wood Despatch) پر مبنی تعلیمی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا اور برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی ضرورتوں کے تحت، انگریزی تعلیم کے ساتھ، مقامی زبانوں خصوصاً اردو کو بھی اہمیت دی تو ابتدائی وثانوی مدارس میں اردو کو دوبارہ ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے جدید طرز کی نصابی کتابوں کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی اور بعض دوسرے اداروں کی طرف سے اس سلسلے میں جو کتابیں مرتب کی گئیں یا جن کے ترجمے کئے گئے ان میں سب سے زیادہ کتابیں تنہا بابو شیو پرشاد کی تھیں[۶۲]۔ یہی شیو پرشاد بعد کو کھل کر سامنے آگئے۔ انہوں نے ہندی زبان میں ہندوستان کی ایک تاریخ ۱۸۶۴ء میں لکھی تھی۔ اس تاریخ میں اور اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن کے سامنے انہیں نے ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں جو کہا اس کا خلاصہ فرانسس رابنسن (Francis Robinson) نے اپنی معرکہ آرا تازہ کتاب مطبوعہ ۱۹۷۴ء میں دے دیا ہے نیز اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ نقطہ نظر صرف شیو پرشاد کا ہے۔ بیشتر ہندو اس سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ بابو شیو پرشاد کے نقطہ نظر کے مطابق:

"For Hindus and Muslims, the question of Language and Script had a more than ordinary significance. For Hindus Hindi was a language purged of all the Arabic and Persian accretions

which served to remind them of the Muslims supremacy while the Nagri Script had a religious significance as the character which Brahmans used and in which Sanskrit was written. For Muslims on the other hand Hindi was dirty and they thought most degrading to learn it. Muslims did not particularly like Urdu, that is Hindi with Arabic and Persian accretions, but in the second half of 19th Centuty, Urdu and the Persian script in which it was written became a symbol of Muslim power and influence; and they came to bestow upon it an almost religious significance. It was the dominant language. In 1837 it had given a great phillip when replaced Persian as the language of Govt. Indeed so rapid was its growth that by 1863, out of twenty three news papers published in the province, seventeen were in Urdu and only four in Hindi and a Hindu revivalist School Inspector was compelled to admit that Urdu is now becoming our mother tongue.[۴۱]

یہاں شیو پرشاد نے یہ ظاہر کر کے کہ " صوبے کے تیس اخباروں میں سترہ اردو کے اور صرف چار ہندی کے ہیں۔ اور یہ کہ کر " اردو اپنی برتری وا ہمیت کی بنا پر ہندوؤں کی مادری زبان بننے والی ہے۔۔ خود بھی اس بات کا واضح اعتراف کیا ہے کہ اردو کی مقبولیت ہندی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ان کی مذہبی و قومی تنگ نظری نے انھیں اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ اردو کو اس کی ہر دل عزیزی کی بنا پر ہندو اور مسلمانوں کی مشترک زبان مان لیتے۔ چنانچہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ شیو پرشاد نے صرف قومی تعصبات کی بنا پر ہندی کی طرفداری اور پرچار کا بیڑہ اٹھایا، انھوں نے اس سلسلے میں جس ہندو قوم پرست انسپکٹر آف اسکول کا ذکر کیا ہے وہ بھی غالباً خود انہی کی ذات تھی اس لئے کہ بنارس کے سرکل میں وہی اس عہدے پر فائز تھے۔[۴۲]

سرسید کے قریبی ہندو دوستوں میں راجہ جے کشن داس بھی اردو کی مخالفت میں بہت سرگرم تھے۔ راجہ کشن داس علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور سرسید احمد خان ان پر اس قدر اعتماد کرتے تھے کہ جب ان کا تبادلہ اگست ۱۸۶۷ء میں جج کی حیثیت میں علی گڑھ سے بنارس ہوگیا تو وہ سائنٹفک سوسائٹی کا سارا کاروبار راجہ صاحب کے سپرد کر گئے۔[۴۳] بعد کو یہی جے کشن داس تھے جنھوں نے اردو ہندی کے تنازع میں مجتہدانہ انداز سے ہندی کی طرفداری کی۔ رابنسن کے الفاظ ہیں:

"Raja Jai Kishan Das, the acting Secertary of the Aligharh Scientific Society, and one of Syed Ahmed Khan's closest freinds, began to urge the cause of Hindi and the Nagri Script

in every possible way; he pressed for abolition of Urdu in Government Offices, he placed a pandit at the Service of the Aligarh High School, and he campaigned for the establishment of Sanskrit College. Eventually, he resigned from the Aligarh Scientific Society on the grounds that he was about to be stationed at Allahabad, but this did not prevent him from becoming Secretary of the Indian Sanskrit Association at Hathras, a few miles from Alighrh.[۶۷]

سرسید احمد خاں ۱۵۔ اگست ۱۸۶۷ء سے لے کر اپنی ملازمت کے آخری زمانے یعنی جولائی ۱۸۷۶ء تک قیام انگلستان کے ڈیڑھ سال کو چھوڑ کر، بنارس ہی میں رہے۔ اور اپنے سارے اہم کاموں کا آغاز یہیں سے کیا۔ ان کے قابل اعتماد ہندو دوست بھی بیشتر یہیں تھے، اور انہی دوستوں سے وہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنی روشن خیالی کے سبب، ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے، آئندہ ہندوستان کی فلاح کے لئے کوشش کریں گے، لیکن بہت جلد انھوں نے یہ محسوس کرلیا کہ یہ محض ان کی خوش گمانی ہے۔ اس لئے کہ بنارس، رفتہ رفتہ ان سازشوں اور سرگرمیوں کا مرکز بنتا جارہا تھا جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں اور اردو کے خلاف جاری تھیں، اور ان سرگرمیوں میں ان کے قریب ترین ہندو دوست بھی شریک تھے۔ اس سلسلے میں ان کو پہلا ذاتی تجربہ غالباً ورناکولر یونیورسٹی کی تحریک کے موقع پر اس وقت ہوا جب ۱۸۶۷ء میں سرسید احمد خاں نے والسرائے اور گورنر جنرل کو ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے بھیجی۔ اس درخوست کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک اعلیٰ درجے کا ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم و امتحان کا انتظام مقامی زبان میں ہو، اور جس میں اسی قسم کی علمی اسناد دی جایا کریں جیسی انگریزی خواں طلبہ کو دی جاتی ہیں یا یہ کہ ایک اردو فیکلٹی، کلکتہ یونیوسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔ اس درخوست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہوگا سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ، انجام دے گی۔[۶۸]

اس درخواست پر بہت سے ہندوؤں کے بھی دستخط تھے، اور جن خاص خاص آدمیوں نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی حامی بھری تھی ان میں بھی بابو شیو پرشاد، جے کشن داس، ماسٹر پیارے لال اور دھرم نرائن وغیرہ شامل تھے۔ اس درخواست پر حکومت نے خاصی توجہ دی تھی، لیکن بعض دوسری باتوں کے ساتھ بڑی رکاوٹ یہ پیدا ہوگئی کہ بنارس کے ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ اردو

کے مخالفین نے اخبارات میں اس بات کا مطالبہ کر دیا کہ اس مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لئے اردو زبان اور ہندوؤں کے لئے ہندی زبان مخصوص کی جائے اگرچہ بقول مولانا حالی یہ بات درخواست دینے سے پہلے طے پاچکی تھی کہ ہندی زبان، سردست علمی وادبی کتابوں کے ترجموں کی، صلاحیت نہیں رکھتی اور اس میں اعلیٰ درجے کی تعلیم وتدریس نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود ناگہاں ہندی کا مطالبہ کیا گیا۔[۲۶] ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ کس طرح بھی قابل قبول اور قابل عمل نہ بن سکتا تھا، اس لئے اردو یونیورسٹی کی تحریک بھی، ہندوؤں کی رخنہ اندازی کے سبب، التوا میں پڑ گئی۔ اس قسم کے واقعات سے سرسید احمد خاں کو ہندوؤں کے تعصب کا پورا اندازہ ہو گیا، اور انھیں ۱۸۶۷ء میں، بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کے سامنے، اپنے اس یقین کا اظہار کرنا پڑا کہ اب دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔[۲۷]

اوپر بیان کئے ہوئے اس پس منظر میں ۱۸۶۷ء کا سال، ہندی اردو تنازع کے آغاز کا سال قرار پاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اردو کی مخالفت اور ہندی کے پرچار کا در پردہ کام اگرچہ پچاس ساٹھ سال پہلے شروع ہو گیا تھا لیکن اجتماعی سطح پر ہندوؤں کی طرف سے اس کا اظہار اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ اس کا پہلا بیج، بنارس کی سرزمین پر بویا گیا۔

حواشی

۱۔ برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقا، ص۔ ۱۵۵
۲۔ کتاب الہند، حصہ اول، مترجمہ سید اسد علی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء ص۔ ۱۶
۳۔ "رود کوثر"۔ فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۰ء، طبع پنجم
۴۔ اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ص۔ ۱۱ تا ۱۵
۵۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا، حصہ دوم، ص۔ ۵۵۲
۶۔ دی پرابلم آف ہندوستانی، ص ۳۲
۷۔ بیسک ڈاکومنٹس، ص۔ ۱۸
۸۔ انڈین مسلمس، ص۔ ۳۴
۹۔ حالی کا سیاسی شعور، ص۔ ۳۰
۱۰۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان (اردو ترجمہ)، ص ۱۹
۱۱۔ حیات جاوید، ص۔ ۱۶۳
۱۲۔ روئداد۔ کل ہند اردو کانفرنس، انجمن ترقی اردو، دھلی، ۱۹۳۹ء، ص۔ ۵۲

۱۳۔ دی بیسک ڈاکومنٹس، ص۔ ۳۳
۱۴۔ جناح گاندھی گفت و شنید، مطبوعہ آل انڈیا مسلم لیگ، دھلی، ۱۹۴۴ء، ص۔ ۵۸ تا ص۔ ۶۵
۱۵۔ جناح گاندھی گفت و شنید، مطبوعہ آل انڈیا مسلم لیگ، دھلی، ۱۹۴۴ء، ص۔ ۵۸ تا ۶۵
۱۶۔ خطبات عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص۔ ۲۴۵
۱۷۔ اے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا، جلد اول، ص۔ ۲۲
۱۸۔ اے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا، جلد اول، ص۔ ۲۳
۱۹۔ انڈیا ز ہندو مسلم کوئسچن، ڈاکٹر بینی پرشاد، ص۔ ۳۱
۲۰۔ لینگوئج، ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان نارتھ انڈیا، پال براس، ص۔ ۱۳۶
۲۱۔ خطبات عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۶۷
۲۲۔ "تاریخ ادب ہندوستانی" کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء، میں دوسری جلد ۱۸۴۷ء میں، اور تیسری جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی
۲۳۔ مقدمہ تاریخ ادب ہندوستانی (اردو ترجمہ) از لیلیان سکستان، جلد اول، مملوکہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، کراچی یونیورسٹی، ص۔ ۵
۲۴۔ دیباچہ برٹش انڈیا مانیٹر، بحوالہ خطبات عبدالحق، ص۔ ۹۴
۲۵۔ دیباچہ برٹش انڈیا مانیٹر، بحوالہ خطبات عبدالحق، ص، ۹۵
۲۶۔ پنجاب میں اردو، حافظ محمود شیرانی، مکتبہ معین الادب، لاہور، ص۔ ۱۶ تا ۴۵
۲۷۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۔ ۱۰
۲۸۔ آداب اردو، گلچین کرنالی، مطبوعہ اردو مینشن، ملتان، ۱۹۶۶ء، ص۔ ۱۷۰
۲۹۔ خطبہ صدارت، یوم اردو، منعقدہ خالق دینا ہال، کراچی (۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء)، مشمولہ "ادبی رابطے، لسانی رشتے"۔ ترجمہ الیاس عشقی، مطبوعہ مجلس ادب، حیدرآباد، ۱۹۷۶ء، ص۔ ۱۰ تا ۱۲
۳۰۔ مقالات محمود شیرانی ص۔ ۵۵ جلد اول مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء
۳۱۔ خطبات عبدالحق، ص۔ ۸۰
۳۲۔ ادب و لسانیات، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص۔ ۲۰۶
۳۳۔ خطبات عبدالحق، ص۔ ۶۷
۳۴۔ دی پرابلم آف ہندوستانی، الہ آباد، ۱۹۴۴ء، ص۔ ۳۱
۳۵۔ وضع اصطلاحات، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص۔ ۱۹
۳۶۔ "کیفیہ، معین الادب، لاہور، ۱۹۵۰ء
۳۷۔ زبان اور اردو زبان، قمر کتاب گھر، کراچی، ۱۹۷۲ء، ص۔ ۲۲
۳۸۔ بحوالہ "اردو معلی"۔ (لسانیات نمبر)۔ دھلی، ۱۹۶۹ء، ص۔ ۵۶

۳۹۔ "تاریخ ادب اردو"، (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری) نول کشور پریس، لکھنؤ، طبع سوم، ۱۹۲۹ء، ص ۱۔۲

۴۰۔ گلکرائسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، علیگڑھ، ۱۹۶۰ء، ص۔ ۱۰۹

۴۱۔ "ارباب نثر اردو"، سید محمد، ایم اے، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص۔ ۲۶۶

۴۲۔ دی پرابلم آف ہندوستانی، الہ آباد، ۱۹۴۴ء، ص۔ ۳۲ تا ۳۳

۴۳۔ خطبات عبد الحق، ص۔ ۱۱۶

۴۴۔ لنگولسٹک سروے آف انڈیا، جلد نہم، حصہ اول، کلکتہ، ۱۹۱۶ء

۴۵۔ تفصیل کے لئے دیکھیے ماہنامہ نگار (ہندی شاعری نمبر)، مرتبہ علامہ نیاز فتح پوری، لکھنؤ، ۱۹۳۶ء، کراچی، ۱۹۶۳ء

۴۶۔ دی پرابلم آف ہندوستانی، الہ آباد، ۱۹۴۴ء، ص۔ ۵۷ تا ۵۸

۴۷۔ لینگویج کان فلکٹ اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ، کیلی فورنیا، ۱۹۷۰ء، ص۔ ۵۲

۴۸۔ ادبی و قومی تذکرے، انجمن ترقی اردو، علیگڑھ، ۱۹۵۱ء، ص۔ ۱۴۔۱۵

۴۹۔ خطبات عبد الحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص۔ ۲۴۵

۵۰۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی ص ۷۹۔ ۸۱ کراچی ۱۹۷۰ء

۵۱۔ ہندو مسلم کلچرل اکارڈ، سید محمود، ص۔ ۶۴، بحوالہ حالی کا سیاسی شعور، ڈاکٹر معین احسن جذبی، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص۔ ۳۸

۵۲۔ بحوالہ ہندو مسلم کلچرل اکارڈ، سید محمود، ص۔ ۶۵

۵۳۔ بحوالہ "مسلم انڈیا"، محمد نعمان، کتابستان، الہ باد، ۱۹۴۲ء، ص۔ ۳۹

۵۴۔ "ہمارے ہندوستانی مسلمان"، ترجمہ صادق حسین، قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص۔ ۱۹

۵۵۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، طفیل احمد منگلوری، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۸ء، ص۔ ۱۵۲

۵۶۔ دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی انس اون ہسٹورین (دی محمڈن پیریڈ) جلد سوم، لندن، ۱۸۶۹ء

۵۷۔ انڈین مسلمس، ص۔ ۲۶

۵۸۔ موج کوثر، شیخ محمد اکرام، فیروز سنز، ۱۹۶۸ء، ص۔ ۱۰۲

۵۹۔ سر سید احمد خاں (اے پولیٹیکل بایوگرافی) شان محمد، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۔ ۳۲

۶۰۔ حیات جاوید، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۔ ۱۶۳ تا ۱۶۴

۶۱۔ دی مسلمس آف برٹش انڈیا، کیمبرج، ۱۹۷۳ء، ص۔ ۱۴۲

۶۲۔ دی مسلمس آف برٹش انڈیا، کیمبرج، ۱۹۷۳ء، ص۔ ۱۴۲

۶۳۔ سیپریٹ ازم امنگ انڈین مسلمس، ص۔ ۳۶

۶۴۔ سپرٹ ازم امنگ انڈین مسلمس، کیمبرج، ۱۹۷۴ء، ص۔ ۷۰

۶۵۔ سپرٹ ازم امنگ انڈین مسلمس، کیمبرج، ۱۹۷۴ء، ص۔ ۷۳

۶۶۔ حیات جاوید، مولانا حالی، ص۔ ۱۵۷۔ اور سر سید احمد خان۔ مولوی عبدالحق، ص۔ ۱۴۳

۶۷۔ سپرٹ ازم امنگ انڈین مسلمس، ص۔ ۷۴

۶۸۔ حیات جاوید، ص۔ ۱۵۸

۶۹۔ حیات جاوید، ص۔ ۱۵۸

۷۰۔ حیات جاوید، ص۔ ۱۶۱

باب دوم

مسلمانوں میں قومی یکجہتی کی تحریک کا آغاز

اردو کے خلاف بنارس میں قائم ہونے والے مرکز کی شاخیں ہر علاقے اور ہر صوبے میں کھولی گئیں۔ جگہ جگہ اردو کے خلاف ہندی کے حمایتی ادارے وجود میں آگئے۔ یہ کام اگرچہ پچھلے کئی برسوں سے کیا جا رہا تھا لیکن جب بنارس کے ہندوؤں نے اجتماعی حیثیت سے قومی مسئلے کے طور پر، اردو کی مخالفت میں تقریر و تحریر کا سلسلہ شروع کیا تو سرسید احمد خاں اور ان کی معرفت پر بعض دوسرے مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس جارحیت کے خلاف آواز بلند کرنی پڑی۔ لیکن ہندوؤں نے مسلمانوں کے احتجاج کی کوئی پروا نہیں کی۔ اردو کے خلاف ان کی شورشیں برابر بڑھتی گئیں، چنانچہ ۱۸۶۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیانی چالیس برسوں میں، اردو ہندی تنازع کے سوا، اور کوئی ایسا مسئلہ یا موضوع نظر نہیں آتا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتنی شدت سے مسلسل زیر بحث رہا ہو، چونکہ یہ بحث ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کے سبب علمی ولسانی دائروں سے آگے بڑھ کر، سیاسی رنگ اختیار کر گئی تھی، اس لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر اس نے گہرا اثر ڈالا۔ دونوں کے سوچنے کا انداز ایسا بدلا کہ ان کی سیاسی منزلیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئیں۔

سرسید احمد خان نے ۱۸۶۷ء میں جس ہندی اردو قضیے کی طرف اشارہ کیا تھا، اس میں، ہندوؤں کی طرف سے بحث میں حصہ لینے والے خصوصیت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو تھے اور ان سب نے اس کام کے لئے خود کو ایک تنظیم کی صورت میں ڈھال لیا تھا مسلمانوں میں البتہ، اس مسئلے کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کرنے والا، سرسید کے سوا کوئی نہ تھا۔ سرسید ہی نے مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلے، ہندوؤں کی اس سیاسی چال یا لسانی تحریک کو سمجھا اور اس کی بحثوں میں حصہ لیا۔ لیکن اپریل ۱۸۶۹ء میں سرسید احمد خاں، پونے دو برس کے لئے انگلستان چلے گئے۔ ان کے جانے سے مسلمانوں، خصوصاً اردو کے حامیوں میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔ ہندوؤں نے اس زمانے میں بڑے طوفان بپا کئے۔ مولانا الطاف حسین حالی کا بیان ہے کہ:

"بنارس میں، بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر اردو کے خلاف پہلی مجلس قائم ہوئی۔ یہیں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی، رفتہ رفتہ اس کے لئے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا اور سبھائیں قائم ہوئیں۔"[1]

لیکن ہندو قومیت کے احیا کی وہ سبھائیں جن کی توجہ دلانے پر، ایک قومی زبان کی ضرورت محسوس کی گئی اور اردو کے بجائے ہندی کو سرکاری دفتروں میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی، ان سبھاؤں میں قدیم ترین راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تھی۔ جو ۱۸۲۸ء میں قائم ہوئی تھی، فرانسس رابنس نے انیسویں صدی کی ہندو تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

From the early nineteenth Century. Hindus in different parts of India had been attempting to reinterpret and refrom their religion and reinforce and reform their society in the light of the new world of leariningand the spirit with which they came into contact through the state education system and the activities of Christian missionaries. The movements inspired by these Hindus, and the reactions they stimulated among orthodox Hindus, were the basis of Hindu revivalism. Major organisations representing various solutions to the intellectual and spiritual problames set by British rule developed in different places. They also developed at different times, a new organisation often being stimulated by contact with reforming influences from another part of India. The first was the Brahmo Samaj founded in Calcutta in 1828. In 1867 the semrmons of the Samaj's leader, Keshub Chandra Sen had a hand in inspiring the formation of Bombay city's partharna Samaj which pressed eagerly for social reform but, unlike its Bengal counterpart, was not prepared to move outside Hinduism.[2]

اس قسم کی تحریکوں نے بعد میں ہندی زبان کی تحریکوں کو جنم دیا، لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے تک کسی باقاعدہ ہندی تحریک کا سراغ نہیں ملتا۔ مولانا حالی نے اردو کے خلاف کام کرنے والی، بنارس کی جس پہلی مجلس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ۱۸۶۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے سرپرست مہاراجہ بنارس تھے۔ بعد میں اسی ادارے کا نام بنارس انسٹی ٹیوٹ ہو گیا۔

اردو کے مخالف اداروں میں بنارس انسٹی ٹیوٹ کے بعد جو ادارہ پیش پیش رہا، وہ الٰہ آباد انسٹی ٹیوٹ تھا۔ یوں تو ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان، ہندوؤں کی کئی مذہبی و سماجی انجمنیں الٰہ آباد میں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں، لیکن جس میں جدید تعلیم یافتہ افراد شریک ہوتے تھے اور علمی و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا تھا، وہ الٰہ آباد انسٹی ٹیوٹ تھا۔ اگرچہ یہ ایک سیکولر ادارہ تھا، لیکن عام طور پر اس میں غیر مسلم ہی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ ۲۶۔ اپریل ۱۸۶۸ء کے اجلاس کی مطبوعہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ۲۶ شرکا میں، صرف ایک مسلمان مولوی زین العابدین شامل تھے۔ جو کہ الٰہ آباد میں سول مجسٹریٹ تھے اور مراد آباد کے رہنے والے تھے۔[۳۳]

۱۸۶۸ء میں جب ایک سرکلر اس طرح کا جاری کیا گیا کہ ہوم گورنمنٹ ملک کی تمام عدالتوں میں کسی خاص مقامی زبان کو رائج نہیں کرنا چاہتی بلکہ اس کی رائے کے موافق، ہر عدالت میں وہ دیسی زبان رائج ہونی چاہئے جو اس ضلعے کی زبان ہو، تو الٰہ آباد انسٹوٹیوٹ کے ہندو ممبر بھی اردو کے خلاف اور ہندی کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء ہی کے ایک اجلاس میں اردو ہندی کے مسئلے پر گرما گرم بحث ہوئی، جس کی تفصیلات ۲۴ نومبر ۱۸۶۸ء اودھ اخبار میں شائع ہوئیں۔

گارسیں دتاسی کے بیان کے مطابق، الٰہ آباد انسٹی ٹیوٹ میں، ہندی اردو کے موضوع پر پہلی اختلافی بحث نومبر ۱۸۶۸ء کے ایک اجلاس میں ہوئی تھی، اس کے بعد اردو کے خلاف تقریر و تحریر کا ایک بڑا محاذ قائم ہو گیا، پے در پے اردو کے خلاف مضامین لکھے گئے اور اب یہ بحث الٰہ آباد تک محدود نہ رہی بلکہ اخبارات و رسائل کی معرفت ہندوستان گیر ہو گئی۔ ۲۵۔ دسمبر ۱۸۶۸ء کے اجلاس میں جب انسٹی ٹیوٹ نے یہ طے کر دیا کہ دیوناگری رسم الخط کو بہر حال رواج دینا ہے اور اجلاس کی روئداد ہندی میں مرتب ہوئی تو اس بحث میں شدت و وسعت پیدا ہو گئی اور اردو ہندی کی موافقت و مخالفت میں مضامین کی اشاعت کا طویل سلسلہ قائم ہو گیا۔ بیشتر مضامین سائنٹفک سوسائٹی اخبار علی گڑھ، تہذیب (لکھنؤ) اودھ اخبار، نور الابصار، اور بنارس گزٹ میں شائع ہوئے۔ اس اثنا میں الٰہ آباد انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری منشی سرود اپرشاد سنڈل اور سرسید احمد خاں کے درمیان اس موضوع پر مراسلت بھی ہوتی رہی اور اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں چھپتی رہی۔ لیکن ۲۰ نومبر ۱۸۶۸ء کو منشی سرود اپرشاد سنڈل نے، اردو ہندی قضیے سے متعلق، سرسید احمد خاں کے نام جو ذیل خط لکھا وہ بعض وجوہ سے خاص اہمیت رکھتا

ہے۔ اس خط کے آخر میں انہوں نے سرسید احمد خاں سے یہ بھی گذارش کی تھی کہ:

"جس طرح سے آپ نے ہماری باہمی خط و کتابت کو اس مقدمے میں پہلے، اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں چھاپا ہے، میری التماس و التجا ہے کہ اس چٹھی کو مع اپنے جواب کے آپ اخبار مذکور میں چھاپ دیں۔"

چنانچہ سرسید نے اس چٹھی کو ۱۹ فروری ۱۸۶۹ء کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں شائع کر دیا۔ منشی سرودا پرشاد سنڈل نے اس طویل خط میں ہندی اور دیوناگری رسم الخط کی تعریف اور فارسی رسم الخط کی تنقیص کی۔

سرسید احمد خاں نے سرودا پرشاد کے مضمون کے جواب میں ایک مضمون ۱۲ مارچ ۱۸۶۹ء کے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی میں شائع کیا۔

الہ آباد انسٹیٹیوٹ میں ہندو اردو کی بحث چھڑنے اور منشی سرودا پرشاد اور سرسید احمد خاں کے درمیان خط و کتابت اور ان کے مضامین کی اشاعت کے بعد ۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیانی عرصے میں اس موضوع پر مختلف اخبارات و رسائل میں سینکڑوں مضامین شائع ہونے، بنارس انسٹیٹیوٹ اور الہ آباد انسٹیٹیوٹ کے ہندو ممبروں کی توجہ خصوصاً اس طرف مرکوز رہی اور انہوں نے ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں ایک ملک گیر مہم شروع کر دی۔ بات نجی محفلوں اور محدود علمی و ادبی حلقوں سے نکل کر عوام تک پہنچ گئی۔ اور ہندو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں ہندی کو نافذ کرانے کے لئے جائز و ناجائز کوششیں کرنے لگے۔ خالص لسانی اور تعلیمی موضوع کو، ہندوؤں نے اپنے لئے قومی اور جذباتی مسئلہ بنالیا۔ تقریر و تحریر میں، نہ صرف اردو پر بلکہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور برصغیر میں ان کے دور حکومت پر رکیک حملے کئے جانے لگے۔ ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبے میں گارسین دتاسی لکھتا ہے کہ:

"اردو اور ہندی کا جھگڑا بدستور چلا جا رہا ہے، چنانچہ اس سال ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس جھگڑے میں نہایت گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیا، بالخصوص ہندو اس معاملے میں تعصب سے کام لے رہے ہیں۔ وہ اپنے حُبّ وطن کے مبالغہ آمیز جوش میں ان تمام چیزوں کو پس پشت ڈالنا چاہتے ہیں جن سے ہندوستان میں مسلمانوں کی سابقہ حکومت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندو لوگ کھلم کھلا برطانوی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت پر ترجیح دیتے ہیں۔"

گارسین نے اردو ہندی کے تنازع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ۶۔ دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبے میں یہاں تک لکھا ہے کہ:

"جس طرح یورپ میں ایک تحریک اٹھی ہے کہ از منہ وسطیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور ان زبانوں کو زندہ کیا جائے جو اب بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی از منہ وسطیٰ کو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس وقت ہندی کی حیثیت ایک بولی کی سی ہے جو ہر گاؤں میں الگ الگ طریقوں سے بولی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کے بجائے ہندی کو فروغ دیا جائے، حالانکہ اردو بہ نسبت ہندی کے شستہ ہے لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص ہندوستان کی زبان ہے اس لئے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں عربی اور فارسی کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔"

گارسین دتاسی کا انیسویں صدی کے وسط میں یہ کہنا کہ اردو میں عربی و فارسی کی ساری خوبیاں جمع ہو گئیں ہیں، بے سبب نہیں تھا۔ اردو پچھلے تین سو سال میں ارتقا کی مختلف منزلیں طے کر کے فی الواقع، زبان و ادب کی بلند معیاری سطح اور ہر دل عزیز مقام پر پہنچ گئی تھی، یہ سارے برصغیر کی لینگوا فرینکا تھی۔ چالیس کروڑ آدمی اسے بولتے اور سمجھتے تھے پال براس نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

In the eighteen and nineteen centuries, especially a large and vital body of literature was written in Urdu in Persian script. It is important to recognize that both Hindus and Muslims contributed to this literature. Although a division gradually developed between Hindus who preferred to write Hindi-Urdu in Deonagri on the one hand and Hindus and Muslims who wrote Hindi- Urdu in persian script, this division was not initially entirely a communal one. Only Hindus used the Deonagri, but both Hindus and Muslims used the persian script.

لیکن ہندوؤں نے ان حقائق سے دانستہ گریز کیا، وہ اردو کی وسعت و مقبولیت کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ اسے عملی زندگی میں ایک مدت سے برت رہے تھے، اس کے باوجود ان کی سیاسی مصلحتیں، انہیں سچائی کے اعتراف کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر اردو اور اس کے رسم الخط پر اعتراضات کئے۔ یہ اعتراضات جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے عیاں ہے، لسانی نہیں سراسر سیاسی تھے اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار

کے مستحکم ہونے کے بعد، ہندوؤں کے ذہن میں آنے تھے۔
بیمز (J.BEAMES) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:

"آج کل عام طور پر اس زبان (اردو) کے خلاف پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے جو عدالتوں اور دفتروں میں رائج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو جن عناصر سے مرکب ہے وہ اجنبی ہیں اور آپس میں میل نہیں کھاتے۔ اردو ہی سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے زیادہ مہذب زبان ہے۔ زبان کی یہ واحد شاخ ہے جو یہاں کے باشندوں کی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔ اردو سے عربی فارسی الفاظ کا خارج کرنا ایسا ہے جیسے انگریزی زبان سے لاطینی الفاظ نکالنے کی کوشش کی جائے اور یہ چاہا جائے کہ اس میں صرف سکسن (SAXAN) اصل کے الفاظ باقی رہیں۔ زبانیں اس طرح بالارادہ نہیں بنائی جاتیں بلکہ وہ رفتار و حالات کا ساتھ دیتی ہیں، اردو میں عربی فارسی سے جو الفاظ مستعار لئے گئے ہیں وہ مطالب کو خالص دیسی زبان کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح واضح کرتے ہیں۔

بعض نے اردو ہندی تنازع کے آغاز کا الزام سر سید احمد خاں کے سر تھوپا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب سر سید احمد خاں نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی تو اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بقول مولوی عبدالحق، جب یہ جھگڑا اٹھا تو اس وقت کانگریس کا وجود بھی نہ تھا سچ یہ ہے کہ جیسے جیسے اردو ہندی کا تنازع بڑھتا گیا، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی خلیج بھی وسیع اور گہری ہوتی چلی گئی۔ کے۔ کے عزیز نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

As political and cultural rivalry increased the two languages began to fall apart. The supporters of Hindi claim for it a national status; the Muslims hotly denied it. As the controversy spread, the two languages became more and more exclusive. Hindi was made "pure" by the progressive incorporation of Sanskrit words. The Urdu enthusiasts went more often to Persian and Arabic for vocablary as well as syntax. Though Urdu was in its origin neither the language of Muslims nor a Muslim Language, it gradually became so. Soon it assumed a place in their tradition, second only to their religion;Thus linguistic conflict added at Indian disunity and helped the formation of more than one nationalism, the more the Hindus laid

stress on Hindi the greater emphasis the Muslim put on Urdu. The Hindi Urdu controversy was by now an integral part of the Hindu- Muslim questions. ۸

۱۸۶۷ء اور اس کے بعد زبان کے سلسلے میں جو اختلافی مسائل پیدا ہوئے، ان کا تجزیہ کرتے ہوئے عزیز احمد نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ دو قومی نظریے کی بنا، سرسید ہی کے زمانے میں انہی کے ہاتھوں پڑ گئی تھی خود ان کے الفاظ میں:

By 1867 emphasis had already began to shift from the use for Hindi as the exclusive language of north Indian Hindus to propaganda and pressure for its exclusive use, at the expense of Urdu, as the language of administration at the lower levels. The movement originated at Banaras and Babu Fateh Chand organised committee with this intent. The early political eclecticism of Syed Ahmed Khan received a shock when Babu Shiv Prashad himself a writer of Urdu, pushed his dislike of the former Muslim rule in India and its heritage to the extent of pressing the Hindu members of Syed Ahmed Khan's Scientific Society to replace Urdu by Hindi as the language of transactions in the Society. The main opposition to Syed Ahmed Khan's plans for a Muslim University came from the Hindu supporters of Hindi.

These developments lit the first spark of modern Muslim Separatism in the mind of Syed Ahmed Khan, who in an interview with shakespeare, then the commissioner for Banaras, talked for the first time of the separate political evolution of Muslims, and expressed a prophetic regret that the two nations, Hindu and Muslim, would not seriously work together for a composite growth. ۹

اردو ہندی تنازع اور سرسید کے حوالے سے، دو قومی نظریے کے آغاز اور مسلم قومیت کی پہلی نمود کے بارے میں کم و بیش اسی طرح کا اظہار خیال، تحریک و قیام پاکستان پر لکھی جانے والی بیشتر کتابوں میں ملتا ہے۔

انیسویں صدی کے بنگالی مسلمانوں کی رہنمائی جسٹس امیر علی اور عبداللطیف کر رہے تھے۔ دونوں اردو کے حامی اور ہندی کے مخالف تھے۔ ڈاکٹر موجمدار نے بنگالی مسلمانوں کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

Their leaders like Amir Ali and Abdul Latif insisted that Urdu and not Bengali was the language of Bengali Muslims and that instructions either be given in Urdu or in a highly persianised Bengali. Though the Government remained somewhat indifferent to this demand the Muslims took it up seriously till the formation for Pakistan. ۱۰

جسٹس امیر علی نے ۱۵۔ نومبر ۱۸۷۱ء کو لندن کی "انجمن فنون" میں ایک مضمون پڑھا تھا اور یہ "اخبار الاخیار" میں چھپا تھا۔ اس میں انہوں نے اردو کے متعلق کہا تھا

"مجھے جن زبانوں کا علم ہے ان میں ایک بھی ایسی نہیں جو فصاحت و بلاغت میں ہندوستانی (اردو) کا مقابلہ کر سکے یا جس کا ذخیرہ الفاظ اس کی طرح مالا مال ہو۔ پنجاب سے لے کر بنگال تک وہ بولی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی نہیں اکثر ہندوؤں کی بھی زبان ہے۔ بنگال کے اکثر شمالی اضلاع میں اردو زبان بولی جاتی ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ وہ دہلی اور لکھنؤ کی اردو کی طرح فصیح نہیں۔ مشرقی بنگال کے مسلمان بھی اکثر اردو بول سکتے ہیں [۱۱]"

کے۔ کے عزیز نے جسٹس امیر علی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

Urdu was the language of the Indian Muslims and any interference with its use and extension was unwelcome to Ameer Ali. In the Nagri- Urdu controversy, which raged in Bihar in the 1880's, he took no active part, but he strongly urged the British Government to withdraw the order substituting the Nagri character for the persian in the Bihar courts, because it irritated and alarmed the Musalmans without satisfying the Hindus. [۱۲]

مولوی فضل الحق نے ۱۹۳۷ء کے کانگریس راج پر تنقید کرتے ہوئے اردو کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ بنگال کے مسلمان موجودہ سنسکرت آمیز بنگالی کے حق میں نہ تھے [۱۳]۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندوؤں کے پروپیگنڈے اور زبردستیوں کے آگے ان کی نہ چل سکی، چنانچہ پال براس نے بھی یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سر سید احمد خاں کے تصور قومیت میں مذہب اور زبان دونوں برابر کے شریک تھے۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے لیکن تاریخی حقائق یہ بھی بتاتے ہیں کہ سر سید احمد خاں کا تصور قومیت جس عنصر کی بدولت حرکت و عمل میں آیا وہ اردو زبان تھی شاید اسی لئے براس کو بھی اکثریت کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھنا پڑا کہ:

The Hindi- Urdu controvesy of the late 19th Century was the critical factor in the development of Muslims separatism and Hindu- Muslim conflicts from that time forward. It is frequently asserted particularly that the Hindi- Urdu controversy was responsible for a fundamental change in the attitudes of Syed Ahmed Khan and his followers towards Hindu-Muslim Unity, of which they despaired when the movement to replace

Urdu by Hindi as the Court language of the northern provinces negan. It is known that Syed Ahmed and his followers pi ved the key role in the defence of Urdu during this period.

جے ۔ داس گپتا نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ:

In North India one of the first open rivalries between Hindus and Muslims, during the late nineteenth century, found a political expression in the rivalry between Hindi and Urdu.[۱۵]

مختصر یہ کہ سرسید کو جس چیز نے سب سے پہلے ہندوؤں سے بدظن کیا اور اس حد تک کہ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ قوم خیال کرنے لگے وہ اردو ہندی کا تضیہ تھا۔

حواشی

۱۔ حیات جاوید، ص۔ ۱۶۴

۲۔ سپریمٹ ازم امنگ انڈین مسلمس، ص۔ ۶۶

۳۔ دی لوکل روٹس آف انڈین پالیٹکس، سی۔ اے۔ بیلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۵ء، ص۔ ۱۱۸۔۱۱۹

۴۔ خطبات گارسین دتاسی، ص۔ ۳۶۸ تا ص۔ ۳۶۹

۵۔ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص۔ ۲۶۶

۶۔ خطبات گارسین دتاسی حصہ دوم، ص۔ ۲۶۷

۷۔ دی علی گڑھ موومنٹ، ایم ایس جین آگرہ۔ ۱۹۶۵ء، ص۔ ۱۳۸۹

۸۔ دی میکنگ آف پاکستان، لاہور۔ ۱۹۶۷ء، ص۔ ۱۲۶

۹۔ اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان دی انڈین ان وار نمنٹ آکسفورڈ، ۱۹۶۴ء، ص۔ ۲۶۰

۱۰۔ دی ایڈونٹ آف انڈیپنڈنس، اے۔ کے۔ موجمدار، ص۔ ۴۴۔۴۵

۱۱۔ مقالات گارسین دتاسی، حصہ اول، ص۔ ۱۶۴

۱۲۔ امیر علی، ہزلائف اینڈ ورک۔ لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۔ ۳۸

۱۳۔ ہماری قومی جدو جہد ۱۹۳۹ء، عاشق حسین بٹالوی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۔ ۳۳۴

۱۴۔ لینگوئج، ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان نارتھ انڈیا، ص۔ ۱۳۷

۱۵۔ لینگوئج کنفلکٹ اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ، ص۔ ۱۰۱

مسلم قومی یکجہتی کا ایک طاقتور محرک، اردو
(۱۸۷۰ء تا ۱۹۰۶ء)

انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں، اردو کی مخالفت میں ہندوؤں کی طرف سے اپنے قومی و سیاسی مفادات کی خاطر جس قسم کی شدت اختیار کی گئی وہ بر صغیر کے مسلمانوں کے حق میں تازیانہ بیداری ثابت ہوئی۔ بات یہ ہے کہ اردو کی جگہ ہندی اور ناگری کے رواج سے مسلمانوں کے حق میں جو مضر نتائج مرتب ہونے والے تھے اور ان کے اجتماعی وُجُود پر جس قسم کی ضرب پڑنے والی تھی انہیں اس کا احساس و ادارک ہو چلا تھا، تعلیمی پستی اور اقتصادی بد حالی کے باوصو، ان میں سیاسی شعور جاگ اٹھا تھا اور اب وہ اپنے ملی وجود کی حفاظت کے لیے فرداً فرداً سوچنے کے بجائے اجتماعی سطح پر غور کرنے لگے تھے۔ خصوصاً سر سید احمد خاں کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اردو پر جو وار کیا جا رہا ہے وہ دراصل مسلم قومیت اور مسلم تہذیب پر وار ہے۔ اگر اردو مٹ گئی تو پھر مسلمان بھی ایک منفرد قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں گے۔ اس لئے انہوں نے اردو کی حفاظت و مدافعت کو قومی فریضہ جانا۔ جب تک رہے اردو کے لئے لڑتے رہے۔ اردو کے مخالفین سے بحث مباحثے کئے، خط و کتابت کی، مضامین لکھے، جگہ جگہ اردو کی حمایت میں انجمنیں قائم کرائیں، مسلمانوں کو مسئلے کی اہمیت و نزاکت کا احساس دلایا اور ہندوؤں کی تردید میں حکومت کو درخواستیں اور عرضداشتیں بھجوائیں۔

لیکن سر سید کی کوئی کوشش اور مسلمانوں کا کوئی احتجاج، اردو ہندی قضیے کے سلسلے میں فوری طور پر کارگر ثابت نہ ہوا۔ حکومت کے جبر اور ہندوؤں کی ضد کے آگے کسی کی نہ چلی۔ ابھی اردو ہندی کے مسئلے پر بحث و مباحثہ شدت سے جاری ہی تھا کہ بنگال کے لفٹننٹ گورنر مسٹر جی کیمبل (G.CAMBLE) ۷ نومبر ۱۸۷۱ء کو ایک تعلیمی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے مظفر پور (بہار) آئے۔ جلسے میں تقریریں ہوئیں۔ ڈاکٹر فیلن اور کیمبل نے انگریزی میں اور جلسے کے سیکریٹری مولوی امداد علی نے اردو زبان میں، کیمبل

صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے سپاسناموں میں کچھ نہ کچھ پر تکلف انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اسلوب کو پر زور و پر شکوہ بنانے میں روز مرہ کی بول چال کے بجائے، عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ جگہ پا جاتے ہیں لیکن مسٹر کیمبل کو اس سپاسنامے کی زبان پسند نہ آئی۔ انہوں نے مولوی امداد علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد، اردو کے خلاف بڑی زہر آلود تقریر کی۔ انہوں نے کہا جس زبان میں یہ ایڈرس پڑھا گیا یہ ہرگز ملکی زبان نہیں اور یہ بہار میں جاری نہیں رہ سکتی۔ چند ہی روز بعد ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو مسٹر کیمبل نے اردو کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے خارج کرنے کے لیے حکمنامہ جاری کر دیا۔ گارسین دتاسی نے کیمبل کے اس حکمنامے کے متعلق لکھا ہے کہ:

"ان کے اس حکمنامے کا ہر طرف مذاق اڑایا جا رہا ہے، انڈین ڈیلی نیوز نے بھی اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مسٹر کیمبل کے احکام کی بلا چوں و چرا پابندی کی جائے اور بہار کے مدارس میں اردو کو ختم کر دیا جائے لیکن اور دوسرے مقامات پر اس زبان کے رواج کو کوئی نہیں روک سکتا۔"[۱]

مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ کیمبل ایک تو پہلے ہی مسلمانوں اور اردو کا دشمن تھا، دوسرے یہ کہ اس وقت بہار میں ڈاکٹر فیلن بہ حیثیت مہتمم مدارس اور انتھونی میکڈانلڈ بہ حیثیت کلکٹر موجود تھے۔ یہ دونوں اردو کے سخت مخالف تھے، چنانچہ انہوں نے لفٹیننٹ گورنر کیمبل صاحب کے کان بھرے۔ اور انہوں نے ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو سرکاری دفتروں سے اردو کو خارج کرنے کی ہدایت جاری کر دی۔ اس ہدایت نامے میں اردو کے بارے میں جس قسم کی بے بنیاد اور مسلمانوں کے سلسلے میں دل آزار باتیں کہی گئی ہیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسٹر کیمبل کو اردو اور مسلمانوں سے کتنی نفرت تھی۔ وہ کھلم کھلا ہندی اور ہندوؤں کی طرف داری کر رہے تھے اور حاکم ہونے کے زعم میں مسلمانوں کی زبان و ثقافت پر ضرب کاری لگا رہے تھے۔[۲]

بنگال اور بہار سے اردو کو خارج کرانے میں، ہندوؤں کو جو کامیابی ہوئی تھی، اس سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا، چنانچہ اب انہوں نے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کا پروپیگنڈا، یوپی اور پنجاب کے اضلاع میں بھی شروع کر دیا۔ ہر شہر میں ہندو سبھا اور ہندی سبھا کے نام سے انجمنیں بنائی گئیں، الہ آباد اور لاہور کی ہندی پرچارنی سبھائیں اس سلسلے میں بڑی فعّال تھیں اور ان کا حلقۂ اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

مسلمانوں نے بھی اس مسئلے پر اجتماعی طور پر سوچنا شروع کیا۔ سر سید احمد خاں کی زیر ہدایت، ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو اردو کی حمایت میں ایک بڑا جلسہ ہوا اور اردو کے دفاع کے لیے ایک صدر کمیٹی الہ آباد میں قائم کی گئی، جس کے سکریٹری سر سید احمد خاں مقرر ہوئے۔ گارسیں دتاسی نے ۱۸۷۴ء کے مقالے میں سید عبداللہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"الہ آباد میں ۸ دسمبر ۱۸۷۳ء کو مولوی فرید الدین، پلیڈر، ہائی کورٹ، کے ساتھ مل کر، انہوں (سید عبداللہ) نے ایک جلسہ منعقد کیا جس کے صدر جعفر علی تھے جس میں الہ آباد کے مشہور مسلمان شریک ہوئے تھے۔ جلسے کا مقصد یہ تھا کہ ممتاز ہندوؤں کی حکومت کے نام اس درخواست کے خلاف احتجاج کیا جائے، جس میں دفاتر اور مدارس میں دیوناگری رسم الخط کے رواج کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس موضوع پر مباحثے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ الہ آباد میں ایک مرکزی کمیٹی قائم کی جائے جس کے سکریٹری سید احمد خاں ہوں اور وہ مجلس کی تجویزات کے مطابق عمل کریں۔"[۳۹]

ڈیفنس سوسائٹی، الہ آباد کا جلسہ ۸ دسمبر کو نہیں ۹ دسمبر کو ہوا تھا اور اس سلسلے میں جو صدر کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں الہ آباد کے نہتر ممتاز شہری شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق زمینداروں اور وکیلوں کے طبقے سے تھا۔[۴۰] الہ آباد کے جلسے کی پوری روداد و قرار داد، ۱۲ دسمبر ۱۸۷۳ء کے علیگڑھ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں صدر کمیٹی کے عہدیداروں کی تفصیل اس طور پر ملتی ہے:

۱۔ پیٹرن یعنی مربی کمیٹی۔ نواب مظفر حسین خان صاحب، رئیس، تعلقہ دار، الہ آباد۔

۲۔ صدر انجمن۔ سید جعفر علی صاحب، رئیس و تعلقہ دار، الہ آباد۔

۳۔ شریک صدر انجمن۔ مولوی محمد حیدر حسین صاحب، رئیس جونپور و وکیل ہائیکورٹ۔

۴۔ نائب صدر انجمن۔ مولوی سید فرید الدین صاحب، رئیس کڑہ و وکیل ہائیکورٹ۔

۵۔ سکریٹری۔ سید احمد خاں، خان بہادر، سی۔ ایس۔ آئی۔

۶۔ جوائنٹ سکریٹری۔ منشی محمد ذکا اللہ صاحب، پروفیسر ورنیکولر، سائنس اینڈ لٹریچر، میور سنٹرل کالج، الہ آباد۔

اردو ڈفینس کمیٹی کیوں بنائی گئی تھی؟ اس کی تفصیل، روئداد کے شروع میں اس طور پر بہ عنوان "اطلاع۔ دی ہوئی ہے۔

"یہ بات معلوم کر کے کہ تھوڑا عرصہ گزرا جو ایک عرضی باستدعائی جاری کیے جانے دیو ناگری کے سرکاری دفتروں اور مدرسوں میں ممالک مغربی و شمالی میں ہندوؤں کے دستخط ہونے کے لیے پھرائی گئی تھی وہ عنقریب گورنمنٹ کے حضور میں پیش ہونے والی ہے اور نیز اس خیال سے کہ صوبہ بہار کے اردو کے طرف داروں کے مستعد اور آمادہ نہ ہونے کے سبب سے دیوناگری کے جاری ہو جانے کا حکم اس ملک میں صادر ہونے تک کوئی عرضی نہ گزر سکی۔ ان صاحبوں نے جو اضلاع شمالی و مغربی میں اردو کو بحال رکھنا چاہتے ہیں۔ تاریخ نویں دسمبر ۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں اس غرض سے ایک جلسہ کیا کہ کسی طرح یہ کارروائی کی جانے اور اس جلسہ کے صدر انجمن سید جعفر صاحب، رئیس و تعلقہ دار، الہ آباد تھے۔

اس جلسے میں یہ طے پایا کہ ایک صدر کمیٹی الہ آباد میں قائم کی جانے اور اس کے سکریٹری سر سید احمد خاں ہوں اور جو باتیں اردو ڈفینس کے سلسلے میں طے پائی ہیں، ان کو ایک سرکلر کی صورت میں بطور اطلاع صوبہ جات شمال و مغرب کے ہر ضلعے میں خاص خاص لوگوں کے پاس بھیجا جانے تاکہ ہر ضلعے میں ماتحت کمیٹیاں، قائم کی جائیں اور صدر کمیٹی کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔ غرض یہ تھی کہ اردو کی حمایت میں جس وقت حکومت کو درخواست دینے کا موقع ہو، لوگوں سے دستخط کرانے میں دیر نہ لگے۔

اردو ڈفینس سوسائٹی، الہ آباد اور اس کے تحت ہر ضلع میں بنائی جانے والی کمیٹیوں کی کوششیں، اردو کے خلاف ہندوؤں کے اٹھائے ہوئے طوفان کو تو نہ روک سکیں لیکن اس کے زور کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ بہار میں بھی حکومت کے احکام پر آسانی سے عمل درآمد نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کی طرف سے بہار، سی پی اور بنگال میں، اردو کی دیرینہ حیثیت کو بحال کرانے کی برابر کوششیں ہوتی رہیں۔ ان کوششوں کا کوئی

مثبت اور دیرپا نتیجہ یوں نہ نکل سکا کہ ہندوؤں سے کہیں زیادہ خود حکومت اردو اور مسلمانوں کے درپے آزار تھی اس کا مقصود، ہندی کی طرفداری کر کے اکثریتی طبقے کو خوش کرنا اور مسلمانوں کے اس پندار کو توڑنا تھا جو کبھی سراج الدولہ، کبھی ٹیپو سلطان، کبھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور کبھی وہابی تحریک کی شکل میں ان کی مزاحمت کرنے سے نہ چوکتا تھا۔ چنانچہ اس کھلی حقیقت کے باوجود کہ اردو، برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ متمول اور مقبول زبان تھی اور ہندی کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا، انگریزوں نے برطانوی مقبوضے کے ہر علاقے میں دانستہ ایسے اقدام کیے جن سے اردو کو نقصان اور ہندی کو فائدہ پہنچا۔ مسلمانوں کی مزاحمت کے سبب، ان اقدامات کو عملی جامہ پہنانے میں البتہ دیر لگی اور جارج کیمبل نے بہار کے دفتروں سے اردو کو خارج کرنے کے لیے جو ہدایت نامہ ۱۸۷۳ء میں جاری کیا تھا وہ ۱۸۸۱ء سے پہلے عملاً نافذ نہ ہو سکا۔[۵۳]

پھر بھی بنگال، سی پی اور بہار میں، ہندوؤں کو ناگری کو جاری اور فارسی کو بے دخل کرانے میں جو کامیابی ہوئی تھی، اس نے ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ انہوں نے اردو کے خلاف، اپنی مہم پوری قوت کے ساتھ جاری رکھی۔ البتہ ان کی مہم کا رخ اب یوپی، پنجاب، سندھ اور سرحد کی طرف مڑ گیا تھا، اس لیے کہ ان علاقوں میں اردو اور فارسی کے اثرات اب بھی بہت گہرے تھے اور ان میں فارسی رسم الخط ہی مروج و مستعمل تھا ہندوؤں کا خیال تھا کہ تعلیم کی کمی اور اقتصادی کمزوری کے سبب وہ مسلمانوں کو آسانی سے اپنی رہ پر لگا لیں گے۔ لیکن سرسید کی علیگڑھ تحریک کے زیر اثر ان علاقوں میں اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ انجمن کے ناموں سے جدید تعلیم کی تحصیل کے ایسے ادارے قائم ہو گئے تھے جن کی معرفت وہاں مسلمانوں میں سیاسی سوجھ بوجھ پیدا ہو چلی تھی۔ نتیجتاً کسی علاقے میں بھی ہندی کے سلسلے میں ہندوؤں کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ہندوؤں کا یہ خیال تھا کہ ناگری کے اجرا میں اگر انہیں پنجاب اور یوپی میں کامیابی حاصل ہو گئی تو پھر دوسرے علاقوں میں کامیاب ہونے میں دیر نہ لگے گی۔ غالباً اسی خیال سے ان کی ساری توجہ یوپی اور پنجاب پر مرکوز ہو گئی، دونوں جگہ ان کا مقابلہ سخت تھا، یوپی میں مسلمان اقلیت میں تھے، اس لیے وہاں تو تقریباً بیس سال بعد انتھونی میکڈانلڈ کی صریح ناانصافی اور

مسلمان دشمنی کی وجہ سے ہندوؤں کو کچھ کامیابی ہوگئی۔ اس کامیابی کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی لیکن پنجاب میں، آخر تک بھی ہندوؤں کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اس ناکامی کے دو خاص سبب معلوم ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ صوبہ پنجاب میں اتفاق سے ڈاکٹر لائنز جیسے بعض ایسے صاحب اثر اور انصاف پسند یورپین افسر، محکمہ تدریس و تعلیم میں موجود تھے، جن کے پیش نظر ہندوستان کی سیاست نہیں بلکہ فی الواقع علمی و ادبی خدمت تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور ان کا یقین تھا کہ برصغیر کی لینگوا فرینکا صرف اردو ہے۔ اس لئے اس کے فروغ کی جانب قدم بڑھانے میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ انہی کے ساتھ ساتھ انہیں مشرقی زبانوں، خصوصاً عربی و فارسی سے بھی گہری دلچسپی تھی اور وہ ان زبانوں کو زندہ رکھنا نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوستان کی پوری تہذیبی و سماجی زندگی کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ پنجاب میں اردو کے مخالفین کی ناکامیابی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اہل پنجاب دوسرے علاقے کے لوگوں کی بہ نسبت مشرقی زبانوں خصوصاً اردو کے دفاع میں زیادہ سرگرم اور پرجوش تھے۔ ہرچند کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں آریہ سماجی ہندوؤں نے لاہور کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا اور پنجاب کے اضلاع میں جگہ جگہ ان کی شاخیں قائم تھیں لیکن اہل پنجاب نے اپنے صوبے کے مسلمانوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑنے دیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے زبان و ثقافت اور مذہب و سیاست کے باب میں ہندوؤں کی بدنیتی کو پوری طرح بھانپ لیا تھا اور اپنے تحفظ و دفاع میں ہر جگہ ہندو سبھاؤں کے متوازی اپنی الگ انجمنیں بنالی تھیں۔ ان انجمنوں میں انجمن پنجاب اور انجمن حمایت الاسلام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

پنجاب میں بھی اردو پر ہر طرح کے اعتراضات برابر ہوتے رہے اور ہندوؤں کی مسلسل یہ کوشش رہی ہے کہ ہندی اور دیوناگری کو اردو کا منصب مل جائے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے مسلمانوں کی کوششیں، اردو کے سلسلے میں صرف تقریر و تحریک تک محدود نہ تھیں بلکہ عملاً بھی وہ اس کے لیے بہت کچھ کررہے تھے، خاص طور پر انجمن پنجاب۔ اس سلسلے میں بڑی جرأت سے کام کررہی تھی۔ انجمن نے پہلا کام یہ کیا کہ ۱۸۶۵ء میں علوم شرقیہ کی ترویج کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا اور لاہور شکشا سبھا نے ۱۸۶۳ میں جو پاٹھ شالا قائم کیا تھا اسے اپنی تحویل میں لے کر، عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا آغاز کردیا۔ ۱۸۶۶ء میں تجربے کے طور پر اس میں کالج کے درجے بھی کھول

دیے گئے، لیکن مالی مشکلات کی بنا پر ۱۸۶۸ء میں اسے بند کر دینا پڑا۔ پھر بھی ایک قرار داد کے ذریعے انجمن نے یہ طے کر دیا کہ جب بھی حالات سازگار ہوں، مجوزہ اورینٹیل کالج کے مقاصد کے مطابق، اس میں مدرسے اور کالج کی کلاسیں شروع کر دی جائیں۔ اسی اثنا میں ایک خوش آئند بات یہ ہوئی کہ ۱۸۷۰ء میں خود حکومت کی طرف سے "پنجاب یونیورسٹی اورینٹیل اسکول۔ قائم کر دیا گیا۔ یہ ادارہ اگرچہ "انجمن پنجاب" کے اس کالج کے مقاصد کے مطابق نہ تھا۔ جو ۱۸۶۸ء میں بند کر دیا گیا تھا، تاہم اس سے اسی قسم کی اغراض پوری ہوتی تھیں۔ یعنی اس میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم و تدریس کا باقاعدہ انتظام تھا۔ پہلے یہ اورینٹیل اسکول کہلاتا تھا۔ ۱۸۷۳ء کے بعد اورینٹیل کالج کہلایا۔ ڈاکٹر لائنز اس کے پہلے اعزازی پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی اور اورینٹیل کالج اس کا ایک جزو بن گیا۔[۷]

پنجاب میں جیسے جیسے عربی، فارسی اور اردو کی اشاعت و ترقی کے امکانات روشن ہوتے جاتے تھے، ویسے ویسے اردو کے خلاف ہندوؤں کی سرگرمیاں تیز تر ہوتی جاتی تھیں چنانچہ ۱۸۸۲ء میں جب تعلیمی سروے کے لیے ہنٹر کمیشن قائم کیا گیا تو اردو کے خلاف، ہزاروں کے دستخط سے متعدد عرضداشتیں، کمیشن کے سامنے پیش کی گئیں۔ یہ مہم یوپی اور پنجاب، دونوں جگہ بہ یک وقت چلائی گئی۔ پال براس نے پنجاب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

The Hindi movement in the the 19th Century in the Punjab was led both by Hindi speaking and Punjabi speaking urban Hindus whose higher education had been in Urud and English. In its origin, it was clearly a religio-political or communal movement, promoted by the arya Samaj to displace Urdu in Persian script as the official language of the province because Urdu was associated with Muslim dominance and Hindi with Hindu religious reform and political aspirations. The Hindi-Urdu controversy in the Punjab arose for the first time in 1882, a year after the decision to substitute Hindi in the Devnagri script for Urdu in Persian script in Bihar. The demand in the Punjab by the urban, was the same and it was seen by both sides as an aspect of Hindu-Muslim communal conflicts. The Anjuman-i-Islamiya of Lahore protested against the movement which it saw as aiming a death-blow to the prospects of the Mohammadans. The famous Arya Samaj leader and Punjab politician late Lajpat Rai, who actually did not know the Hindi alphabets, entered political life in this controversy because he came to

believe that Hindi could be the foundation for the edifice of Indian nationality. Lala Lajpat Rai learnt his first lesson in "Hindu rationalism" and became convinced that political solidarity demanded the spread of Hindi and Devanagri. لے

غرض کہ اردو کے مخالفین اوران کے ساتھیوں کواپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔اول اس لیے کہ پنجاب کے مسلمان، اردو کے سلسلے میں ہر محاذ پر چوکنا اور مستعد رہے۔ دوسرے اس لئے کہ محکمہ تعلیم پنجاب کے انگریز افسروں نے اس موقع پر مسلمان دشمنی سے کام نہ لیااوراپنی رپورٹوں میں وہی لکھاجو عوامی ضرورتوں اور انصاف کا تقاضا تھا۔ تیسرے اس لیے کہ "انجمن پنجاب" کے علاوہ بھی، اردو کی حمایت میں کئی انجمنیں قائم تھیں اور یہ سب کچھ نہ کچھ اپنے موقف کے دفاع میں کر رہی تھیں۔ یوپی میں ۱۸۸۲ء کے ایجوکیشن کمیشن سے اردو کے لیے جو خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ بھی وقتی طور پر ٹل گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مسلمانوں نے متحد ہو کر اردو کے مسئلے سے گہری دلچسپی لی، دوسرے یہ کہ اس وقت اتفاق سے سرسید احمد خاں وائسرائے کونسل کے ممبر تھے۔ انہوں نے ہنٹر کمیشن کے ارکان پر پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ اردو ہندی کا قضیہ ایک سیاسی قضیہ ہے، تعلیمی کمیشن کو اس سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ ایجوکیشن کمیشن نے یہی کیااور ہندوؤں کا ایجیٹیشن کامیاب نہ ہوسکا۔

لیکن مسلسل ناکامیوں کے باوجود ہندوؤں نے اردو کی مخالفت میں اپنی مہم کسی نہ کسی شکل میں جاری رکھی۔اس سلسلے میں اب ان کی سرگرمیاں صرف ہندی کو آگے بڑھانے، یا اردو کو نقصان پہنچانے تک محدود نہ رہیں، بلکہ انیسویں صدی کی آخری دھائیوں میں انہوں نے متعدد ایسی مذہبی و سماجی تحریکوں کو جنم دیا جن کا مقصد بھی واضح طور پر ہندو کلچر کا احیا، ہندی کی ترویج، اردو کی مخالفت اور ہندوؤں کو ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے ابھار کر، ہمیشہ کے لیے مسلمانوں پر مسلط کرنا تھا۔ اس تحریک میں قدیم ترین سماجی تحریک راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج (۱۸۲۸ء) تھی۔ برہمو سماج کے ایک رہنما کیشوب چندر سین کی تقریروں کے زیر اثر بمبئی میں "پرارتھنا سبھا" قائم کی گئی، برہمو سماج اور پرارتھنا سبھا سے متاثر ہو کر ۱۸۷۵ء میں دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی، یہ خالصاً ہندو جماعت تھی اور کسی غیر ہندو کو اس کا ممبر بننے کی اجازت نہ تھی۔ سارے پروگرام مذہبی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے۔ اس جماعت کا بنیادی مقصد، ہندو مذہب کو ویدوں کے مطابق ڈھالنا اور ہندوؤں کو طاقتور بنا کر، غیر ہندو کے خلاف انہیں

جنگ پر آمادہ کرنا تھا۔ دیانند سرسوتی نے سنسکرت آمیز ہندی میں ایک کتاب بھی "ستیارتھ پرکاش" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کے ذریعے ایک طرف انہوں نے جدید ہندی کو تقویت پہنچائی، دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں مذہبی اشتعال پیدا کیا۔ عزیز احمد نے دیانند سرسوتی کے متعلق لکھا ہے کہ:

It is interesting that the first work written in pure' and highly sanskritized (Sanskrit-Nistha) Hindi, was the Satyartha Prakash of Dayanand Saraswoti, the founder of the aggressive revivalist Arya Samaj, who was the first to give a conscious and definite expression to the view that Hindi should be the 'Pan-Hindu Language of India'. Not very different was the analysis of Moulana Mohammad Ali arrived at from the opposite point of view: 'Hindi is the constructive work of the Advocate of Pan-Hinduism.........., its first creation is the result not of comprehension and inclusion, but of elimination and exclusion.' Whereas the Arya Samajist Dayanand considered the religious duty of every Hindu to promote Hindi, the Arya Bhasha (the Aryan language), the more moderate and traditionalist movement of Hindu revivalism, the Sanatan Dharam, led by Pandit Sharda Ram, also recommended its use. ۸

"ستیارتھ پرکاش" نامی کتاب کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ یہ سنسکرت آمیز ہندی میں ہے یا اس میں ہندو مت کی اہمیت و بزرگی بیان کی گئی ہے بلکہ اس میں دیگر مذاہب بالخصوص اسلام پر رکیک حملے بھی کئے گئے ہیں۔ دیانند سرسوتی نے بعد کو واضح طور پر اعلان کیا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے۔ مسلمانوں کو یا تو ہندوستان چھوڑ کر چلے جانا چاہئے، یا ہندو ہو جانا چاہئے۔ غرضیکہ دیانند سرسوتی کی "آریہ سماج" ہندوؤں کی ایک کٹر اور مسلمان دشمن جماعت تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اس کا پروپیگنڈا اتنا منظم اور اتنی وسعتیں لئے ہوئے تھا کہ ہندوستان سے باہر بھی اس کا ایک حلقہ اثر پیدا ہو گیا تھا۔ فرانسس رابنسن نے برہمو سماج اور پرارتھنا سماج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

Both these societies contributed much to the formation of a third organisation, which had its greatest impact in the Punjab, the Arya Samaj. Founded by Dayanand Sarswati in 1875, it aimed at purging Hinduism of its degenerate forms by establishing virtually a new religion which was based on a reasoned interpretation of the Vedas and supported all those social reforms urged by Western-educated Hindu Society.

Sarswati's teaching so impressed the leaders of the Theosophical Society founded in New York in 1875 that, with the aim of amalgamating their movement with the Arya Samaj, they come to India. The connection with the Samaj was brief and ended in tears. In the 1880s and 1890s Arya Samajist attacked the Muslims with increasing intensity. The Leader of the crusade, Pandit Lakh Ram, condemned all forms of Islam, particularly the "Naturalist Muhammadis' that is Syed Ahmed Khan' s Aligarh movements, and demanded that the Muslims should be either expelled from India or converted to arayanism. The crusade lost vigour only after Lakh Ram's assassination in 1897, Such antiagonism towards the Muslims and Muslim culture resulted, almost inevitably, from the growth of a new sense of Hindu identity. It had impotant political implications.[۹]

۱۸۸۲ء میں دیانند سرسوتی جی نے گئورکھشا سبھا (سوسائٹی فار دی پروٹیکشن آف کاؤز) قائم کی اور گاؤ ذبیحہ کے بہانے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے، گائے کے احترام کے بارے میں اصول و قوانین شائع کئے۔ اور آخر آخر شدھی کے نام سے انہوں نے غیر ہندو کو فرداً فرداً ہندو بنانے کی تحریک چلائی۔[۱۰]

جس سال "گئورکھشا سبھا" قائم ہوئی اسی سال یعنی ۱۸۸۲ء میں ایک بنگالی ہندو بنکم چندر چٹرجی نے ایک ناول "آنند مٹھ" یعنی "مسرت کی خانقاہ" کے نام سے لکھا۔[۱۱] جس میں، مسلمانوں اور ہندوستان میں ان کے عہد حکومت کے خلاف، جی کھول کر زہر اگلا گیا۔ ہندوؤں کا قومی ترانہ "بندے ماترم" اسی ناول کا حصہ ہے۔ یہ ناول، صرف بنکم چندر چٹرجی یا ان کے عہد کی ہندو ذہنیت کا ترجمان ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پچھلے ڈیڑھ دو سو سال سے، مسلمانوں کے بارے میں ہندو، کس طرح سوچ رہے تھے۔ اس نام نہاد تاریخی ناول میں، واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور ہندو جنتا کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا گیا ہے۔

ہندوؤں کی اس قسم کی تحریکیں، جن کا مقصد بظاہر مذہب کی اصلاح اور حقیقت میں ہندو قومیت کا سیاسی فروغ تھا، یکے بعد دیگرے وجود میں آرہی تھیں کہ انگریزوں کی حسب منشا ایک ریٹائرڈ انگریز آئی۔ سی۔ ایس افسر مسٹر ہیوم (HUME) کی تجویز پر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ہندوؤں کی ایک ملک گیر سیاسی جماعت بھی منظر عام پر آگئی۔ اگرچہ بقول مولانا حسن ریاض "ہندوؤں کے پاس پہلے ہی سے بہت سی انجمنیں تھیں، مثلاً انڈین ایسوسی ایشن بمبئی، مدراس میں مہاجن سبھا اور پونا

میں سرد جنگ سمجھا۔ ہندوؤں میں تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے جو انجمنیں قائم کر رہے تھے اور چلا رہے تھے، مگر سب صوبائی، پورے ہندوستان کی ایک انجمن کوئی نہ تھی[۱۲]۔ کانگریس کے قیام نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ کانگریس نے کیوں اور کس پس منظر میں جنم لیا اس کا احوال خود کانگریس کے ممتاز لیڈر، پٹا بھٹی سیتا رمیا نے اس طور پر بیان کر دیا ہے۔

"مسٹر ہیوم برطانوی عہدہ دار تھے، ان کو یہ معلوم ہوا کہ ملک میں سیاسی بے چینی ہے اور خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ کہیں یکایک شورش پھیل جائے، پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت کی جائے۔ اس پر ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام قائم ہونا چاہئے جس سے برطانوی حکومت ان سازشوں سے محفوظ رہ سکے[۱۳]۔"

کانگریس کا پہلا اجلاس ۱۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ہوا۔ اس میں ستّر ہندو اور صرف ایک مسلمان نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں جی کھول کر انگریزوں کی تعریف کی گئی ہونا بھی یہی چاہئے تھا اس لئے کہ کانگریس کا وجود، انگریزوں کا مرہون منت تھا۔ ہیوم کے علاوہ اس زمانے کے کئی ممتاز انگریز جو کہ برطانوی پارلیمنٹ کے رکن یا ہندوستان میں افسر اعلیٰ رہ چکے تھے کانگریس کی تحریک و تنظیم میں شریک تھے۔ شروع میں کئی سال تک، سالانہ جلسوں کی صدارت بھی یہی انگریز کیا کرتے تھے۔ جب کوئی ممتاز انگریز، انگلستان سے آتا تھا تو اس کو شاندار استقبالیہ دیا جاتا تھا اور بعض انگریز محسنوں مثلاً لارڈ رپن کی سالگرہ منائی جاتی تھی اور مبارکباد کا ریزولیوشن منظور کیا جاتا تھا[۱۴]۔

سرسید احمد خاں چونکہ ہندوؤں کی چالوں سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں ان پر خود غرضی اور برطانیہ نوازی کے بے بنیاد الزامات لگائے گئے، اور بعض دوستوں نے انہیں مختلف طریقوں سے کانگریس کا ہم نوا بنانے کی کوشش کی، لیکن انہوں نے اپنے دلائل سے سب کو لاجواب کر دیا۔ سرسید کا اختلاف بے سبب نہیں تھا، وہ جانتے تھے کہ کانگریس کے سامنے دو بنیادی مقاصد ہیں:

۱۔ برصغیر کے سارے باشندوں کو خواہ وہ بلحاظ مذہب و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ایک قومیت کے نام سے ہندو قومیت میں ضم کرنا۔

۲۔ ایک قومی نظریے اور مخلوط طریقہ انتخاب کے ذریعے مقامی خود مختاری کے اداروں میں اور مقابلے کے امتحان کے ذریعے سرکاری دفتروں میں، ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ داخل کر کے، حکومت میں شریک ہونا۔

یہ دونوں باتیں مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ تھیں، برصغیر میں اکثریت چونکہ ہندوؤں کی تھی اس لئے مخلوط انتخاب کے ذریعے، کسی مسلمان کا منتخب ہونا مشکل تھا اور اگر کوئی ہوتا تو وہ ہندوؤں کے رحم و کرم کی بدولت ہوتا۔ مقابلے کے امتحانات میں عام طور پر ہندو ہی کامیاب ہوتے، اس لئے کہ اس وقت امتحانات انگریزی زبان میں لئے جاتے تھے، اور ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمان جدید تعلیم میں اتنے پس ماندہ تھے کہ وہ ہندوؤں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں مناسب یہی تھا کہ آبادی کی نسبت سے خود مختار اداروں اور سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کا جو حصہ بنتا تھا۔ وہ ان کو دے دیا جاتا اور کانگریس کے تجویز کردہ مخلوط انتخاب اور مقابلے کے امتحانات کی زد سے ان کو بچایا جاتا، سرسید احمد خاں نے یہی کیا مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک اور وقار الملک نے ان کی تائید کی۔

۱۸۸۸ء میں مسٹر ہیوم اور طیّب جی نے سر توڑ کوشش کی کہ سرسید احمد خاں کانگریس میں شریک ہو جائیں[۵] لیکن سرسید کو وہ قائل نہ کر سکے، چنانچہ سرسید احمد نے طیب جی کو ایک خط کے جواب میں لکھا:

"میں نیشنل کانگریس کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں، کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف ذاتیں، فرقے اور مذاہب کے افراد رہتے بستے ہیں، ایک قوم کے افراد ہیں یا یہ کہ ایک قوم بن سکتے ہیں، اور ان کے مقاصد و اغراض دینی و ملّی بھی یکساں اور ایک ہی ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز بالکل ناممکنات میں سے ہے اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگریس جیسی بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نہ یہ ساری قوموں کے لئے یکساں طور پر سود مند ہو سکتی ہے۔ آپ غلط نام یافتہ نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں کو ہندوستان کے لئے سود مند تصور کرتے ہیں، لیکن بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان سرگرمیوں کو میں نہ صرف اپنے ہم مذہبوں کے لئے مہلک اور مضرت

رساں سمجھتا ہوں بلکہ ہندوستان کے لئے بھی من حیث المجموع باعث
زیاں ہی خیال کرتا ہوں۔ میں ہر اس کانگریس کا مخالف ہوں خواہ وہ
کسی ہیئت اور وضع کی ہو جو ہندوستان کو ایک قوم واحد قرار دیتی ہو۔[۱۷]
آگے چل کر ۱۸۹۳ء میں، سر سید احمد خاں نے، اپنے سیاسی خیالات کی مزید
وضاحت اس طور پر کر دی کہ:

Long before the idea of founding the Indian National Congress was mooted, I had given thought to the matter whether representative Government is suited to the conditions of India. I studied John stuaart Mill's views in support of Represantative Government. He has dealt with this matter exceedingly well in great detail. I reach the conclusion that the first requisite of a representative government is that the voters should possess the highest degree of homogeneity. In a form of Government which depends for its functioning upon majorities, it is necessary that the people should have no differences in the matter of nationality, religion, ways of living, customs, modes, culture and historical traditions. These things should be common among the people to enable them to run a representative Government properly. only when such homogeneity is present can a representative government work or prove beneficial. It should not even be thought of when these conditions do not exist.

In a country like India where homogeneity does not exist in any of the fields, the introduction of representative government cannot produce any beneficial results; it can only result in interfering with the peace and prosperity of the land. I sincerely hope that whichever party comes into power in Great Britain-be they the conservatives, the Liberals, the Unionists, or the Radicals-they will remember that India is a continent, it is not a small and homogeneous country like England, Scotland, Wales or Ireland. India is inhabited by different peoples, each one of whom is numerically large and different from the others in its culture, its moral code, its social organisation, its political outlook, its religion, its physique, and its historical associations. These peoples have never been united since the downfall of the Muslim Empire. Instead of being able to organise some other form of Government they have just indulgéd in mutual fighting and internecine wars.

The aims and objects of the Indian National Congress are based upon an ignorance of history and present day realities: theydo not take into consideration that India is inhabited by different nationalities, they presuppose that the Muslims, the Marathas, the Brahmins, the Kashatriyas, the Banyas, the sudras, the Sikhs, the Bengalees, the Madrasees and the Peshawarees can all be treated alike and all of them belong to the same nation. The congress thinks that they profess the samereligion, that they speak the same language, that their way of life and customs are the same, that their attitude to History is similar and based upon the same historical traditions.............
I considered the experiment which the Indian National Congress wants to make, fraught with dangers and sufferings for all the nationalities of India, specially for the Muslims. The Muslims are in minority, but they are a highly united minority. Atleast traditionally they are prone to take the sword in hand when the majority oppresses them........... The Congress cannot rationally prove its claim to represent the opinions, ideals and aspirations of the Muslims.۱۷

سر سید کے کانگریس سے الگ رہنے اور دوسروں کو الگ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس شروع ہی سے عملاً ایک ہندو جماعت رہی، عام مسلمانوں نے کبھی اسے اپنی نمائندہ جماعت نہیں سمجھا۔ کچھ مسلمان البتہ کسی ترغیب یا جبر سے اس کے ممبر بن گئے تھے، ورنہ سر سید کے پرانے دوستوں اور مسلمانوں کے ملی رہنماؤں میں سبھی نے کانگریس کی مخالفت کی۔ مولانا حالی، محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد اور وقار الملک نے قوم اور قومیت کے سلسلے میں سر سید احمد کی پیروی کی۔ صرف یہی نہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس کو صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت جانا، بلکہ ہندوؤں سے الگ، مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے منظم و مضبوط کرنے کی صورتوں پر بھی غور کرنا شروع کر دیا۔

اسی زمانے میں، اردو کے نامور ادیب ناول نگار، مورخ اور "دلگداز" و "مہذب" کے مدیر، مولانا عبدالحلیم شرر نے ہندوؤں کی پے در پے زیادتوں کے پیش نظر ۱۸۹۰ء میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

"اوقات کچھ ایسے ہیں کہ ایک قوم کی مذہبی عبادات، اس وقت تک ادا نہیں کی جا سکتیں جب تک کہ دوسری قوم کے زود اثر جذبات کو ٹھیس نہ لگائیں اور نہ صبر و تحمل کا ایسا کوئی عنصر موجود ہے جو اہانت کو نظر انداز کرے۔ اگر نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے تو پھر عقلمندی کا تقاضا یہ ہے

کہ ہندوستان کو ہندو صوبوں اور مسلمان صوبوں میں منقسم کر دیا جائے
اور آبادیوں کا تبادلہ ہو جائے ۔ہندو بظاہر اس خیال کے حامی نظر آتے
ہیں کہ انہیں مسلمانوں کو بہ حیثیت پڑوسی رہنے کی اجازت نہیں دینی
چاہیئے ۔ نہ ہی انہیں یہ بات پسند ہے کہ ان کے مندوروں کے ناقوس کی
آوازیں، مسلمان کافروں کے کانوں میں گونجیں اور نہ وہ خود اذان کی آواز
سننا پسند کرتے ہیں ۔ یقیناً یہ حل مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو گا ۔
اس لئے کہ وہ بھی ہندوؤں سے غالباً تنگ آچکے ہیں۔[۱۸]

شرر کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے اردو ہندی تنازع کے حوالے سے ۱۸۶۷ء میں جس دو قومی نظریے کی طرف اشارہ کیا تھا وہ انیسویں صدی کے آخر تک، پورے طور پر ایک اہم سیاسی مسئلہ بن چکا تھا اور اس مسئلے کے حل کی عملی صورتوں پر غور کیا جانے لگا تھا ۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی و اقتصادی حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ وہ ہندوؤں سے یا ہندوؤں کی سرپرست برطانوی حکومت سے صف آرائی کی سکت نہ رکھتے تھے ۔ اس لئے وہ بہ حیثیت مجموعی صلح و مفاہمت ہی کی کوششیں کرتے رہے ۔ مسلمانوں کی اس صلح جوئی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، ہندوؤں کی جارحیت روز بروز بڑھتی گئی ۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے نیشنل کانگریس کے نام سے جس نئی تنظیم کو ۱۸۸۵ء میں جنم دیا تھا اور جسے ہندوستان کی پوری آبادی کی نمائندہ ظاہر کیا جا رہا تھا وہ بھی اپنی روح میں ہندو قومیت اور اس کی جارحانہ ذہنیت ہی کی ترجمان تھی، ایف ۔ کے درانی نے کانگریس کے سلسلے میں پٹا بھائی سیتار میا کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

It was admittedly a culmination of Hindu revivalism. Pattabhai Sitaramayya, writing as late as 1938, says:

> "All these movements (viz., Brahmo Samaj, Prarthana Samaj, Arya Samaj. Mrs. Besant's Theosophical Movement with its centre at Benares the holy city of India, and the Ramakrishna Mission) were really so many threads in the strand (sie) of Indian Nationalism, and the Nation's duty was to evolve a synthesis so as to be able to dispel prejudices and superstition, to renovate and purify the old faith, the Vedantic indealism, and reconcile it with the Nationalism of the new age. The Indian National Congress was destined to fulfil this great mission.

Clearly then, it was a Hindu Organisation with ideals of purely Hindu Nationalism, for the realisation of which it would have been wholly irrelevent and absurd for the Muslims to join it. ۱۹

- مسلمانوں کے خلاف اس جارحیت کی ایک مثال مشہور کانگریس لیڈر بال گنگا دھر تلک کی وہ تحریک ہے جو ۱۸۹۳ء میں نمودار ہوئی۔ گنگا دھر تلک صرف ہندوؤں کو ہندوستان کا باشندہ اور مسلمانوں کو غیر ملکی یا بدیسی سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور جنگی جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے ہر سال ہندو دیوتا گنیش کی پوجا کا میلہ لگانا شروع کیا۔ یہ میلہ جو کہ گنپتی میلہ (GANPATI MELA) کہلاتا تھا دس دن تک جاری رہتا تھا۔ اس میں اس قدر اشتعال انگیز تقریروں، ڈراموں اور نعرہ بازیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ ہندو مشتعل ہو کر مسلمانوں پر حملے شروع کر دیتے تھے۔ چنانچہ اس میلے کے سبب مختلف شہروں میں بلوے ہوئے، مسلمانوں کو قتل و غارت کا نشانہ بنایا گیا اور مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی ۲۱

یہی نہیں تلک نے ایک اور تحریک شروع کی اور وہ یہ تھی کہ انہوں نے شیوا جی کو ہندوؤں کا ہیرو قرار دیا۔ اس کے سمادھ کی مرمت کرائی اور انہیں اس کے مثالی کارناموں سے تعبیر کیا گیا۔ تاریخی واقعہ یہ ہے کہ شیوا جی نے دوستی کے رنگ میں افضل خان کو بغل گیر ہوتے ہوئے دھوکا دے کر قتل کر ڈالا تھا۔ تلک نے شیوا جی کے اس بزدلانہ اور غیر اخلاقی فعل کا جواز یہ کہہ کر پیدا کر لیا کہ اگر چور گھر میں گھس آئے اور اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکے تو اسے گھر میں بند کر کے جلا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ انہوں نے انسداد گاؤ کشی کے لئے بھی ایک سوسائٹی قائم کی اور ذبیح گاؤ کے خلاف تحریک چلائی۔ اپنے ان پروگراموں کو کامیاب بنانے کے لئے دو اخبار بھی نکالے۔ ایک کیسری (KESARI) کے نام سے مرھٹی زبان میں، دوسرا انگریزی میں "دی مرہٹہ" (THE MARATHA) کے نام سے ۲۲ دونوں میں مذہبی تعصبات پر مبنی اشتعال انگیز مضامین شائع کئے جاتے تھے۔

لیکن بال گنگا دھر تلک کا بنا کردہ گنپتی میلہ، ہندوؤں کے قومی و مذہبی تعصبات کے مظاہروں کے سلسلے میں نیا نہ تھا۔ اس سے بہت پہلے بنگال کے ہندوؤں نے اسے

شروع کر دیا تھا اور انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے سے کئی سال قبل سے خود کو ایک الگ اور برتر قوم متصور کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر اشوک موجمدار کا بیان ہے کہ:

"Rajnarayin Bose initiated the Hindu-Mela which met annually from 1867 to 1880 and for which Tagore wrote two charming songs. Inspired by the Hindu-Mela, the "National Society" was founded in 1870 to promote unity and national feelings among the Hindus. When objection was taken to the use of word "National" for Hindu Organisation' the "National Paper", the organ of the Hindu-Mela replied: " We do not understand why our correspondent takes exception to the Hindus who certainly form a nation by themselves and as such a society established by them can very properly be called a National Society." ۲۳

جس سال گنگا دھر تلک نے گنپتی میلے کی بنا ڈالی، سی سال کانگریس کے ایک اور مشہور لیڈر پنڈت مدن موھن مالویہ نے بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا قائم کی، جیسا کے اس کے نام سے ظاہر ہے اس کا مقصد ناگری کی حمایت اور اردو کی مخالفت کا پروپیگنڈا تھا، ہندو قومیت اور اس کے نقطہ نظر کو قبول عام بنانا بھی اس کے دائرہ عمل کا ایک حصہ تھا۔ ۲۴ غایت یہ تھی کہ جلد سے جلد برصغیر پر ہندوؤں کا سیاسی تسلط قائم کر کے مسلمانوں کی ثقافتی اور ملی انفرادیت کو ختم کر کے واحد قومیت میں ضم کر دیا جائے

ہندوؤں کی ان سیاسی و سماجی اور مذہبی انجمنوں نے، مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش میں، انہیں بیدار بھی کر دیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی اپنی علمی و ادبی اور ثقافتی و مذہبی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے ملّی ادارے اور انجمنیں بنانا شروع کیں۔ سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کے زیر اثر جگہ جگہ اسلامیہ اسکول اور کالج قائم ہونے جن میں مذھبی تعلیم کے ساتھ انگریزی پڑھانے کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس قسم کی انجمنوں میں پنجاب کی " انجمن حمایت اسلام " کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ اس کا حلقہ اثر صرف پنجاب تک محدود نہ تھا، بلکہ برصغیر کے ہر علاقے کے مسلمانوں کو اس نے متاثر کیا تھا اور سب اس کے بہی خواہ تھے۔ انجمن کی مذہبی و سماجی اور تعلیمی و سیاسی سرگرمیوں کے پیش نظر بعض کا یہ خیال کہ " اس انجمن نے سابق پنجاب میں وہی کام کیا ہے جو شمالی ہند میں سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک نے۔ بڑی حد تک درست ہے۔ ۲۵ ایسا ہونا شاید اس لئے بھی ممکن ہوا کہ یہ انجمن سرسید تحریک کے اثر سے وجود میں آئی تھی

اور پنجاب میں اسی لگن سے کام کر رہی تھی۔ جس طرح شمالی ہند میں سر سید کر رہے تھے ڈاکٹر رضی واسطی نے انجمن حمایت اسلام کے قیام کو سر سید کی تعلیمی و قومی کوششوں کا بدیہی نتیجہ قرار دیا ہے اور بجا قرار دیا ہے[۲۷]۔ اپریل ۱۹۰۴ء میں انجمن کے سالانہ اجلاس میں، جس میں علامہ اقبال بھی شریک تھے، مولانا حالی نے "انجمن حمایت اسلام" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی اس کے ایک شعر میں انہوں نے انجمن کو مسلمانوں کی دایہ اور پنجاب کی ماں قرار دیا تھا۔

تجھ سے امیدیں ہیں وابستہ بہت احباب کی
قوم کی دایہ ہے تو اور ماں ہے تو پنجاب کی

مولوی عبدالحق نے اپنی ایک تقریر میں اہل پنجاب کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

یہ انجمن آپ کی سرزمین پر ابر رحمت کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ اس کے ادارے بڑھتے جاتے ہیں۔ اس کے کارنامے ترقی پر ہیں۔ اس کے مقاصد میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اور اس کا اثر اور اس کی وقعت مسلم ہے۔[۲۸]

اب ہندو تحریکوں کے تشدد و جارحیت کا نشانہ صرف یوپی کا علاقہ تھا۔ بنیادی اور نمایاں اختلاف کا سبب، وہی ہندی اردو کا قضیہ تھا۔ ہندو چاہتے تھے کہ سی پی اور بہار کی طرح، یوپی میں بھی اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری اور عدالتی زبان بنا دیا جائے۔ اس کے لئے ان کی کوششیں پچھلے چالیس سال سے جاری تھیں لیکن ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قیام کے بعد، ان کوششوں میں مزید تیزی و توانائی پیدا ہو گئی۔ مدن موہن مالویہ کی "ناگری پرچارنی سبھا" سب سے زیادہ فعّال اور جارح تھی اور اسے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت و ہمدردی بھی حاصل تھی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، ایک طرف کانگریس کے انتہا پسند ممبر تھے دوسری طرف "ناگری پرچارنی سبھا بنارس" کے بانی اور پر جوش کارکن بھی۔ انہوں نے اردو کے خلاف ایسا زبردست پروپیگنڈا شروع کیا اور اکثریت کی بنیاد پر ہندوؤں کو اتنا بدظن و مشتعل کیا کہ جگہ جگہ ناگری پرچارنی سبھا کی شاخیں قائم ہو گئیں اور اردو کو دفتروں اور اسکولوں سے خارج کر کے ہندی کو ناگری رسم الخط میں، جگہ دینے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اتفاق سے اسی زمانے یعنی ۱۸۹۵ء میں اردو کے جانی دشمن اور مسلمانوں کے مخالف انتھونی میکڈانلڈ، صوبہ شمالی و مغربی واودھ کے لفٹیننٹ گورنر ہو گئے اب کیا تھا۔ ہندوؤں کی دلی مراد بر آئی۔ انہوں نے میکڈانلڈ سے مل کر اردو کے خلاف ایسا

زبردست دھماکہ کیا کہ جس نے نہ صرف یوپی بلکہ برصغیر کے سارے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ میکڈانلڈ کے آتے ہی ہندوؤں کی طرف سے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں پھر آواز اٹھائی گئی اور مارچ ۱۸۹۸ء میں ایک طویل محضر نامہ لفٹیننٹ گورنر کو اس غرض سے پیش کیا گیا کہ عدالت اور سرکاری دفتروں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے بجائے ہندی اور ناگری رسم الخط کو رائج کیا جائے۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں جبکہ یہ محضر نامہ حکومت کو پیش کیا گیا۔ سرسید احمد خاں اگرچہ بستر مرگ پر تھے، پھر بھی انہوں نے اردو پر جو بے جا الزامات لگائے گئے تھے۔ ایک طویل مقالے کی صورت میں ان کا جواب لکھا۔ یہ مقالہ ان کی وفات سے صرف نو دن پہلے ۱۹۔ مارچ ۱۸۹۸ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں الہ آباد میں اردو کے لئے جو ڈفنس کمیٹی بنائی گئی تھی اسے بھی سرسید احمد نے کچھ مفید مشورے دئے۔

ہندوؤں کی عرضداشت کے جواب میں متعدد مقالے چھپے۔ کئی درخواستیں حکومت کو مختلف علاقوں سے بھجوائی گئیں۔ احتجاجی جلسے ہوئے اور اردو ہندی، ناگری کے رواج سے پیدا ہونے والی، قباحتوں کی طرف ارباب اقتدار کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن حکومت اور میکڈانلڈ پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لفٹیننٹ گورنر میکڈانلڈ نے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو ہندوؤں کے مطالبے کو تسلیم کر لیا، ہندی اور ناگری کو عدالت میں باریابی حاصل ہو گئی۔[30] میکڈانلڈ کے اس فیصلے نے مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ محمد امین زبیری کے الفاظ میں، سبب یہ تھا کہ:

> "مسلمانوں کے لئے من حیث القوم یہ ریزولیوشن (میکڈانلڈ کا حکمنامہ) سخت مضر تھا تعلیم اور وسیع و ترقی پذیر لٹریچر، عدالتی و تجارتی اور تمدنی کاروبار، ہندو مسلم اتحاد، غرض سب ہی اس کی زد میں تھے۔"[31]

مجبوراً سرسید احمد خاں کے بعد، ان کے رفقا، اور دوسرے مسلمان، سینہ سپر ہو کر اردو اور مسلمانوں کے دوسرے قومی مفادات کے تحفظ کے لئے میدان میں آگئے۔ نواب محسن الملک نے اپنی کوٹھی پر ایک مختصر سا جلسہ ۲ مئی ۱۹۰۰ء کو منعقد کیا۔[32] جس میں آئندہ کے لئے پروگرام طے کیا گیا اور اس کے مطابق ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں نواب لطف علی خاں کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ اس میں نواب محسن الملک نے ایک پرزور دپرجوش تقریر کی جس کی تمہید میں حاضرین کو اعتدال و صبر و تحمل اور ادب و

احترام کو ملحوظ رکھ کر کارروائی کرنے کی ہدایت کی گئی۔

علی گڑھ کے جلسے میں نواب محسن الملک کی تقریر کے بعد، اس سلسلے میں ایک عرضداشت مرتب کرنے اور لکھنؤ میں مسلمانوں کے جلسہ عام بلانے کی تجویز منظور ہوئی یہ کام بھی نواب محسن الملک ہی کے سپرد ہوا[۳۳]۔

میکڈانلڈ کو علی گڑھ کا یہ احتجاجی جلسہ اور اس کی کارروائی بہت ناگوار گزری انہوں نے اپنی تقریر اور بعض خطبوں میں اس پر سخت نکتہ چینی کی اور اس میں شریک مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے ڈرایا دھمکایا۔ چنانچہ اس کے بہت سے شرکا نواب محسن الملک اور ان کے مرتب کئے ہوئے پروگرام سے علیحدہ ہو گئے[۳۴]۔

نواب محسن الملک کی تقریر اور اردو کی مدافعت میں ان کی دوسری کوششوں سے میکڈانلڈ سخت برہم ہو گئے، وہ خود علی گڑھ گئے اور ۲۶ اگست ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ مسلم کالج کے ٹرسٹیوں کا جلسہ طلب کیا۔ تقریر فرمائی اور اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ الزام لگایا کہ اس تحریک کی تائید میں کالج کے طلبہ سے پروپیگنڈا کرایا گیا۔ کالج کے اساتذہ، آنریری سکریٹری اور بعض ٹرسٹیوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ بالآخر یہ دھمکی دی کہ اگر یہ طریقہ جاری رہا تو کالج کو گورنمنٹ سے جو امداد ملتی ہے وہ بند کر دی جائے گی۔ صرف یہی نہیں انہوں نے صوبے کے بعض اضلاع کا دورہ کر کے مسلمان رئیسوں کو تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی تائید کی تو ان کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ کالج کو حکومت کے قہر سے بچانے کے لئے نواب محسن الملک نے آنریری سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا[۳۵]۔ لیکن کالج کی خاطر، مسلمانوں کے اصرار سے استعفیٰ واپس لے لیا اور اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن سے مستعفی ہو گئے۔

اوپر نواب محسن الملک کی جس تقریر کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا نمبر ان کے مجموعہ تقاریر میں ۵۲ ہے اور اس کا عنوان اس طور پر درج ہے:

> **"اسپیچ جو ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو سنٹرل اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اجلاس اول لکھنؤ میں بہ حیثیت پریذیڈنٹ ہونے کے ریزولیشن نمبر ۱ کی تحریک کرتے ہوئے فرمائی[۳۶]۔"**

اس عنوان اور دوسری متعدد شہادتوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے جلسہ عام کی صدارت نواب محسن الملک نے کی تھی۔ لیکن بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ لکھنؤ کے جلسے کی صدارت میر انیس کے بیٹے میر خورشید علی نفیس نے کی تھی[۳۷]۔ یہ بات یکسر بے

بنیاد معلوم ہوتی ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ نفیس نے اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کے سلسلے کے کسی اور مقامی جلسے کی صدارت کی ہو اس لئے کہ اردو ڈفینس ایسوسی ایشن پہلے کئی برسوں سے قائم تھی اور اس کی بنیاد سر سید احمد خاں نے ۱۸۷۳ء میں بمقام الہ آباد ڈالی تھی اور اس کی شاخیں جگہ جگہ قائم کی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء میں سنٹرل اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کی طرف سے جو بڑا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ اور جس میں میکڈانلڈ کے حکمنامے کے خلاف قرار داد منظور کی گئی تھی، اس سے بہت پہلے بھی لکھنؤ میں اردو ایسوسی ایشن کے جلسوں کے انعقاد کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۰ء کے اجلاس کی روئداد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے اس کی صدارت شیخ علی عباس کی تحریک اور احتشام علی کی تائید پر جلال الدین شاہ اسمٰعیل مرزا صفوی نے کی تھی اور اتفاق رائے سے چھ آدمیوں کو "ابتدائی کمیٹی حمایت اردو" کا جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ ان چھ میں ایک نام عبدالحلیم شرر کا بھی تھا۔ اس میں بالاتفاق رائے یہ امور بھی طے پائے تھے کہ:

۱۔ جہاں جہاں کمیٹیاں، حمایت اردو کے واسطے قائم ہوئی ہیں وہاں خط و کتابت کر کے تمام حالات دریافت کئے جائیں تاکہ ان کمیٹیوں میں اتحاد پیدا کیا جائے اور بعد دریافت حالات، یہ تجویز کیا جائے کہ یہ کمیٹی سنٹرل کمیٹی قرار پائے کہ جس کے ماتحت اور کمیٹیاں رہیں یا یہ کہ یہ کمیٹی خود کسی اور سنٹرل کمیٹی کے ماتحت ہو۔

۲۔ صوبہ اودھ کے خاص سربر آوردہ اصحاب سے کمیٹی کی ممبری کی درخواست کی جائے اور جو ان میں منظور کریں انہیں ممبر کیا جائے۔

۳۔ جو تار حسب تجویز جلسہ، بخدمت لفٹیننٹ گورنر بحضور وائسرائے ہند بھیجے گئے ہیں ان کے مضامین پڑھے گئے اور منظور ہوئے۔

۴۔ اس کمیٹی میں سات آدمیوں کا کورم ہو۔

۵۔ جو تار بھیجے گئے ہیں ان کے مصارف کے لئے چندہ کیا جائے اور جمیع ممبران کی خدمت میں فہرست چندہ بھیجی جائے۔

۶۔ سید ظہور احمد صاحب جوائنٹ سکریٹری کو ٹریزرار مقرر کیا گیا۔

۷۔ اگلا جلسہ اس کمیٹی کا ۱۵ مئی کو بوقت ۵ بجے شام اسی مقام پر ہو گا[۳۸]

۳۰ اپریل ۱۹۰۰ء کی مندرجہ بالا روئداد کی پیشانی پر جلسہ "ابتدائی کمیٹی اردو" درج

ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور اجلاس کی نامکمل رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ رضا حسین کی تجویز اور نواب مہدی حسن فتح نواز جنگ بیرسٹرایٹ لا اور نواب سید مہدی حسین کی تائید پر ایک تجویز یہ قرار پائی تھی کہ:

"ایک خاص کمیٹی اس غرض سے منتخب کی جانے کہ وہ ان تمام امور کا انتظام وانصرام کرتی رہے جو خاص مسئلہ ناگری واردو کے متعلق پیش آتے ہیں یا ضروری سمجھتے ہیں۔۔

اس کمیٹی میں ازتیس آدمیوں کے نام دئے ہوئے ہیں۔ پہلا نام نواب مہدی حسین فتح نواز جنگ کا ہے اور آخری سید خورشید حسن کا۔ اس کمیٹی کو یہ بھی اختیار دیا گیا تھا کہ:

"وہ حسب ضرورت اس کے ممبروں میں اضافہ کر سکتی ہے۔ نیز نواب مہدی حسین کی تحریک پر یہ طے پایا تھا کہ ایک جلسہ کمیٹی منتخب شدہ کا کل پانچ بجے شام مکان انجمن رفاہ عام میں ابتدائی اصول طے کرنے کے لئے منعقد ہو اور جلسہ کمیٹی میں پانچ حاضرین کا کورم ہو۔"

جس اجلاس کا یہ ذکر ہے وہ لائل ٹاؤن ہال میں ہوا تھا۔[۳۵] لیکن تاریخ و دیگر تفصیلات کا پتہ یوں نہیں چلتا کہ روئیداد نامکمل ہے اور اس کے صرف دو صفحے محفوظ ہیں ایک جلسہ لائل ٹاؤن ہال میں ۳۰ اپریل ۱۹۰۰ء کو ہوا تھا اسے جلسہ دوم کمیٹی حمایت اردو کا نام دیا گیا ہے لیکن چند ناموں کے علاوہ کوئی چیز رپورٹ میں محفوظ نہیں ہے۔[۳۶]

اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی طرف سے یہ ساری کارروائیاں حقیقت میں نواب محسن الملک کی ہمت اور قیادت کے سبب عمل میں آسکیں۔ انہوں نے صرف جلسے جلوس اور یادداشت بھیجنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک وفد کی صورت میں لفٹیننٹ گورنر سے ملنے اور صورت حال کی وضاحت کرنے کی اجازت بھی چاہی۔ لیکن میکڈانلڈ نے اس کی اجازت نہ دی اور سکریٹری سے کہلوا دیا کہ خط وکتابت ہی کافی ہے۔ ہر چند کہ یہ عمل بے حد توہین آمیز تھا اور اس سے میکڈانلڈ کی خفگی بھی ظاہر ہوتی تھی لیکن محسن الملک اس کی پرواہ نہ کرکے اردو کے دفاع کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ میکڈانلڈ نے ان پر الزام لگایا کہ انھوں نے حکومت کو اطلاع کئے بغیر اور عام مسلمانوں کی رائے معلوم کئے بغیر ان کے حکم کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ ساتھ میں گورنر نے ان کے نام کے ساتھ "محسن الملک" لکھنا بھی چھوڑ دیا، حالانکہ یہ خطاب انہیں ۱۸۸۷ء میں گورنر جنرل کی

طرف سے ملا تھا اور سرکاری مراسلات میں ان کے نام کے ساتھ برابر استعمال ہوتا تھا اور میکڈانلڈ کو اسے محذوف کرنے کا اختیار نہ تھا۔[۴۱] یہ سب کچھ نواب محسن الملک اور دوسرے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے اور اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کو ختم کرنے کے لئے کیا جارہا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ نواب محسن الملک وقتی طور پر، اردو ایجی ٹیشن سے کنارہ کش تو ہو گئے لیکن جیسے ہی حالات بدلے اور میکڈانلڈ صاحب صوبہ شمال اور مغرب و اودھ سے گئے وہ اردو کی حمایت میں پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب انہوں نے اس سے زیادہ مضبوط و دیرپا دفاعی صورتوں پر غور کرنا شروع کیا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

"Mohsin-ul-Mulk also did not allow his love for Urdu to die out. When the angry heat of personal controversy had subsided and Sir Anthony Mac Donald had left the province, he organized Anjuman-e-Urdu as a wing of Mohammadan Educatinal Conference."[۴۲]

اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اردو کے سلسلے میں مسلمانوں کی جدوجہد کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ میکڈانلڈ نے ہندی اور ناگری کے حق میں جو حکم صادر کر دیا تھا وہ بحال رہا۔ صرف اس قدر ہوا کہ ہندی اور ناگری کے ساتھ اردو اور اس کا رسم خط بھی عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں برقرار رکھا گیا۔ اس لحاظ سے ۱۸۶۷ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی اور اس کے ترجمان اردو زبان پر جو پے در پے حملے کئے گئے تھے وہ نتائج کے اعتبار سے کارگر ثابت ہوئے۔ ۱۸۵۰ء سے پہلے، ہندی اور ناگری کا عملی زندگی میں کہیں کوئی وجود نہ تھا، اب پنجاب کو چھوڑ کر بنگال، بہار، سی پی اور یوپی ہر جگہ ہندی اور ناگری کا راج تھا۔ بعد ازاں اگرچہ ہندوؤں نے پنجاب اور سندھ میں بھی ناگری رسم الخط کو رواج دینے کی کوششیں جاری رکھیں لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ پنجاب میں اردو ہی کا سکہ چلتا رہا اور سندھی کے لئے بھی فارسی رسم الخط ہی مقبول رہا۔

اردو کی جگہ ہندی اور ناگری برصغیر کے کئی صوبوں میں رواج تو پا گئی لیکن پچھلے پچیس برسوں میں حکومت نے ہندو اکثریت کو خوش رکھنے کے لئے زبان کے تضیے کے سلسلے میں جس صریح ناانصافی اور طرفداری سے کام لیا۔ اس نے نہ صرف بنگال، بہار، سی پی اور یوپی کے مسلمانوں کو حد درجہ مضطرب و کبیدہ خاطر کیا بلکہ برصغیر کے سارے مسلمانوں کو زبان کے مسئلے نے دل برداشتہ کر دیا۔ اول اس لئے کہ جو صوبے دیوناگری کی زد سے محفوظ رہ گئے، وہاں بھی ہندو اسے جاری کرنے کی پوری کوششیں کر چکے تھے۔

دوسرے یہ کہ اردو ان کے لئے فارسی کا بدل اور باہم رابطہ خیال کا واحد وسیلہ تھی اور ان کے علمی و ادبی کارنامے اور مذہبی و ثقافتی آثار و نقوش سب سے زیادہ اردو ہی زبان میں محفوظ تھے۔

مسلمانوں کے برعکس زبان کے مسئلے میں حکومت کی طرفداری اور کامیابی کے سبب ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے، آریہ سماج، برہمو سماج، گئو رکھشا سبھا، گنپتی میلہ اور اس طرح کی دوسری ہندو جماعتیں، ہندو قومیت کو فروغ دینے کے لئے ایسے فرقہ وارانہ اقدامات سے کام لے رہی تھیں جو مسلمانوں کے عقائد کے خلاف اور ان کے لئے دل آزار تھے۔ ہندوؤں کی سیاسی تنظیم "کانگریس" کی عمر بھی اب پندرہ سال ہو چکی تھی۔ اور وہ مقامی خود مختاری کے اداروں اور صوبائی کونسلوں میں مقامی باشندوں کی نمائندگی کے سوال پر حکومت سے سودے بازی کرنے لگی تھی۔ لیکن صرف مذکورہ بالا سیاسی و سماجی جماعتوں کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اسی سال یعنی ۱۹۰۰ء میں جبکہ اردو کے سلسلے میں مسلمان احتجاج کر رہے تھے ہندوؤں کی ایک اور مذہبی جماعت "بھارت منڈل" کے نام سے وجود میں آگئی۔[۴۳] اس کے روح رواں ابتداً مہاراجہ در بھنگہ تھے بعد میں یہی جماعت "ہندو مہاسبھا" میں ڈھل گئی اور کانگریس کے تقریباً سارے اہم لیڈروں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ رہیں۔ غرضیکہ مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہندوؤں نے حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے جو محاذ قائم کر لیا تھا وہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں تک مضبوط تر ہو گیا۔

مولوی محمد بشیر الدین نے جو کہ اردو ہندی تنازع سے گہری دلچسپی لے رہے تھے اور جنہوں نے میکڈانلڈ کے حکم نامے کے رد عمل میں اردو کی موافقت اور ناگری کی مخالفت میں متعدد مضامین اپنے رسالہ "البشیر" اٹاوہ میں چھاپے تھے[۴۴] مسلم لیگ کے جواز و قیام کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

> "میکڈانلڈ بہ حیثیت پیٹرن، محمڈن کالج، علیگڑھ آنے اور انہوں نے ٹرسٹیوں کو جمع کر کے اس ایجی ٹیشن پر جو اردو ڈیفنس کے ذریعے سے کی جاتی تھی۔ سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن بند ہو گئی، تاہم میکڈانلڈ کی مخالفت زبان اردو، اور نیز مسلمانوں کو ملازمت نہ دینے کی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور اسی وقت پولیٹکل ایسوسی ایشن قائم کرنے کی بحث بھی

اخبارات میں شروع ہوئی جس کا نتیجہ مسلم لیگ کی صورت میں ظاہر ہوا[۲۲]
نواب وقار الملک کے متعلق بھی ان کے تذکرہ نگار محمد امین زبیری نے یہی لکھا ہے کہ:

"۱۹۰۰ء میں جب صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے ہندی کے اجرا کے متعلق اپنا ریزولیوشن صادر کیا تو نواب صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے اور اب ان کے لئے زمانہ کے تغیرات اور سیاسی خیالات و حالات سے بے تعلق رہنا دشوار ہوگیا اور اس ریزولیوشن کی احتجاجی کارروائیوں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ لکھنؤ کی مشہور میٹنگ میں شریک ہونے پُرزور تقریر کی اور اسی وقت سے ان کو قومی حقوق کے تحفظ کا خیال پیدا ہوگیا۔ ایک پولیٹکل آرگنائزیشن کو قائم کرنے کی تحریک شروع کر دی[۲۳]"

سر رضا علی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ

"اردو کے سلسلے میں میکڈانلڈ کے رویے کو مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا اصل سبب اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہونے کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ ۱۹۰۰ء میں میکڈانلڈ نے جو بیج بویا تھا اس نے چھے سال کے عرصے میں زمین کے اندر جڑ پکڑلی اور ۱۹۰۶ء میں ایک پودے کی صورت میں ظاہر ہوا[۲۴]"

حواشی

۱۔ مقالات گارسین دتاسی، حصہ اول، ص۔ ۱۸۴
۲۔ سرسید احمد خان، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص۔ ۶۱ تا ۶۴
۳۔ مقالات گارسین دتاسی، حصہ دوم، انجمن ترقی اردو، دھلی، ۱۹۴۳ء، ص۔ ۴
۴۔ دی لوکل روٹس آف انڈین پالیٹکس (الہ آباد)، سی۔ اے بیلی، آکسفورڈ ۱۹۷۵ء، ص۔ ۶۶
۵۔ سیپرٹ ازم امنگ انڈین مسلمس، ص۔ ۴۷

۶۔ تاریخ یونیورسٹی اورینٹیل کالج، ص۔ ۸ تا ۴۴
۷۔ لینگونج، ریلیجن اینڈ پالیٹکس، ص۔ ۲۸۷
۸۔ اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان دی انڈین انوائر منٹ، آکسفورڈ، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۱۔ ۲۶۰
۹۔ سیپریٹ ازم امنگ انڈین مسلمس، ص۔ ۶۶ تا ۶۹
۱۰۔ انڈین سیکولرزم، پروفیسر شریف المجاہد، ص۔ ۴۲
۱۱۔ دی میکنگ آف پاکستان، ایف کے درانی، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۔ ۵۶
۱۲۔ "پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی اشاعت دوم، ۱۹۷۰ء، ص۔ ۳۱
۱۳۔ دی ہسٹری آف دی کانگریس، جلد اول، مدراس، ۱۹۳۵ء، ص۔ ۸
۱۴۔ دی ہسٹری آف دی کانگریس، جلد اول، ص۔ ۹۷
۱۵۔ پاکستان منزل بہ منزل، ص۔ ۶۹
۱۶۔ انڈین مسلمس، ص۔ ۶۷، بحوالہ پاکستان منزل بہ منزل، ص۔ ۶۹
۱۷۔ بیسک ڈاکومنٹس ان دی ڈیولپمنٹ آف ماڈرن انڈیا اینڈ پاکستان، ص ۴۱۔ ۴۲
۱۸۔ پاکستان منزل بہ منزل، ص۔ ۷۶۔ ۷۷، از شریف الدین پیرزادہ۔ گلڈ انجمن کتاب گھر، ۱۹۶۵ء
۱۹۔ دی میکنگ آف پاکستان، ص۔ ۷۰۔ ۷۱
۲۰۔ انڈین مسلمس (اے پولیٹیکل ہسٹری)، ص۔ ۸۷
۲۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۔ ۲۷۰
۲۲۔ اے ہسٹری آف دی انڈین نیشنلسٹ موومنٹ، ص۔ ۴۸
۲۳۔ اڈونٹ آف انڈپنڈنس، ص۔ ۳۹۔ ۴۰، بحوالہ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان، ص۔ ۳۴۵
۲۴۔ سپریٹزازم امنگ انڈین مسلمس، ص۔ ۶۷
۲۵۔ تاریخ نظریہ پاکستان، ص۔ ۱۲۹، از پیام شاہجہان پوری، مطبوعہ انجمن حمایت اسلام، لاہور، ۱۹۷۰ء
۲۶۔ دی پولیٹکل ٹرانی اینگل ان انڈیا (۱۸۵۸ء تا ۱۹۲۴ء)، ص۔ ۲۷، مطبوعہ

پیپل پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۷۶ء
۲۷۔ کلیات نظم حالی، جلد دوم، ص۔۲۸۱، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء
۲۸۔ خطبات عبدالحق، ص۔ ۴۳
۲۹۔ حیات جاوید، ص۔ ۱۶۵
۳۰۔ حیات جاوید، ص۔ ۱۶۶
۳۱۔ حیات محسن، مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڑھ، ۱۹۳۴ء ص۔ ۱۵۳
۳۲۔ تذکرہ محسن، ص۔ ۹۵، محمد امین زبیری، دھلی، ۱۹۳۵ء
۳۳۔ موج کوثر، شیخ محمد اکرم، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۷۔۱۶۶
۳۴۔ تذکرہ محسن، ص۔ ۱۰۳
۳۵۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص۔ ۴۷
۳۶۔ مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص۔ ۳۳۷۹
۳۷۔ مقدمہ انگریزوں کی لسانی پالیسی، ص۔ ۲۲
۳۸۔ سیاسی تنظیموں کی ابتدائی روئیدادیں، جلد اول، بابت ۱۹۰۰ء، ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء، مخزونہ آرکائیوز آف فریڈم موومنٹ، کراچی یونیورسٹی ص۔ ۱۰
۳۹۔ سیاسی تنظیموں کی ابتدائی روئیدادیں، مخزونہ آرکائیوز آف فریڈم موومنٹ، کراچی یونیورسٹی، ص۔ ۱۰
۴۰۔ سیاسی تنظیموں کی ابتدائی روئیدادیں، مخزونہ آرکائیوز آف فریڈم موومنٹ، کراچی یونیورسٹی ص۔ ۱۰
۴۱۔ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۸۷
۴۲۔ ماڈرن مسلمس آف انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان، ص۔ ۸۹
۴۳۔ تاریخ نظریہ پاکستان، ص۔ ۱۴۶
۴۴۔ حیات محسن، حاشیہ ص۔ ۱۵۹
۴۵۔ حیات محسن، حاشیہ ص۔ ۱۶۰
۴۶۔ تذکرہ وقار الملک، مطبوعہ اسلامیہ ھائی اسکول، اٹاوہ، ۱۹۲۵ء، ص۔ ۴۴
۴۷۔ اعمال نامہ، ص۔ ۸۵، دھلی ۱۹۴۳ء

باب چہارم

مسلم قومی یکجہتی اور تحریک پاکستان

(۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۶ء)

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ، مسلمانان پاک و ہند کی جو قومی جماعت وجود میں آئی اس کے دو خاص مقصد تھے ، ایک سیاسی دوسرا ثقافتی۔ سیاسی مقصد کی غایت یہ تھی۔ کہ مقامی خود مختاری کے اداروں میں ، مقامی باشندوں کو جو نمائندگی دی جا رہی ہے وہ مخلوط انتخاب کے ذریعے نہیں ، جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر دی جائے یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ایک قوم تسلیم کر کے نمائندگی کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں ہندوؤں کو صرف ہندو اور مسلمانوں کو صرف مسلمان ووٹ دے سکیں یا پھر ملک کی آبادی کے تناسب سے ، ہندو اور مسلمانوں کی نشستیں ، ہر ادارے کے لئے محفوظ کر دی جائیں۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ اس جمہوری نظام میں جس کے آثار برصغیر میں پیدا ہو چلے تھے اور جس میں اہم سے اہم ملکی و قومی فیصلے اکثریت کی رائے سے ہوتے ہیں ، اس میں مسلمانوں کے مذہب ، ان کے عقائد ، ان کے ملی ڈھانچے ، ان کی تعلیم و تاریخ ، ان کی تہذیبی زندگی ، ان کے رسوم و آداب ، ان کی ثقافتی اقدار اور زبان و ادب کے تحفظ و ترقی کی آزادانہ کوشش کی جا سکے۔ غور کیا جائے تو یہ دوسرا مقصد جسے سہولت کے لئے ثقافتی کہا گیا ہے ، دراصل سیاسی مقاصد ہی کے تابع تھا اس لئے کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے بغیر ثقافتی مقاصد کی حفاظت و ترقی کا خیال عملاً ایک بے معنی سی بات تھی۔

مسلمانوں کے یہ مقاصد ، جنہیں لے کر مسلم لیگ آگے بڑھی تھی۔ نئے نہ تھے بلکہ پچھلے پچاس سال سے ان کے حصول کی کوشش ہو رہی تھی۔ خاص طور پر ۱۸۶۷ء کے بعد ہندی اردو تنازع نے جو صورت اختیار کر لی تھی ، اس سے سر سید احمد خاں بہت بددل تھے اور انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی و ثقافتی مقاصد کے حصول کے لئے اسی وقت سے کچھ نہ کچھ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نوع کی کوششوں میں سب سے اہم اور دوررس نتائج کا حامل کام "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" کا قیام تھا[1]

• مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۔ ۱۸۸۶ء میں یعنی آل انڈیا نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء سے ایک سال بعد قائم ہوئی اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ۔ اس کا بنیادی مقصد ، مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلانا تھا لیکن اس سے سیاسی مقاصد کے حصول کی صورتیں بھی پیدا ہو گئیں ۔ اس لئے کہ یہی پہلی ملک گیر جماعت تھی جس میں مختلف علاقے کے مسلمانوں کو ایک ساتھ مل بیٹھنے اور اپنے مشترک مقاصد پر تبادلہ خیال کا موقع ملتا تھا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۶ء میں بمقام علی گڑھ سمیع اللہ خان کی زیر صدارت ہوا تھا۔ اس میں سرسید نے اپنے خطبے میں کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا:

"اس وقت ہمارا یہ حال ہے، کہ گو ہم ایک قوم مسلمان کہلاتے ہیں، مگر ایک جگہ کے رہنے والے ، دوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ناواقف ہیں جیسے کوئی اجنبی قوم ، ایک دوسرے کے حال سے ناواقف ہو، ہم نہیں جانتے کہ پنجاب کے لوگوں کا قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت کیا خیال ہے اور انہوں نے کیا کیا ہے اور کیا کرنا چاہئے ، پنجاب تو ایک دوسرا صوبہ ہے ہم کو اپنے ہی صوبے کے ایک ضلعے کے رہنے والے ، دوسرے ضلع کے رہنے والوں کے حال سے محض ناواقف ہیں کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں۔ ایک کے حال سے دوسرے کو آگہی ہو، ہم مل جل کر اپنے خیالات ، جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں ، دوسروں پر ظاہر کر سکیں ، ایک دوسرے کے خیالات سے تبادلہ ہو۔ ان ہی خیالات سے تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی تعلیم و ترقی پر غور کرنے کے لئے ایک جگہ جمع ہوا کریں اور ایک صوبے اور ایک ضلع کے لوگوں کے ذریعے سے دوسرے صوبے اور ضلع کے مسلمانوں کو حالات معلوم ہوتے رہیں اور جو تدابیر ان کی بھلائی اور ترقی کی نسبت سوچی جائیں ان پر بحث مباحثہ ہو کر جو تدبیر عمدہ قرار پائے اختیار کی جائے۔"[۲]

واقعہ یہ ہے کہ کانفرنس کا قیام ، سرسید کے خوابوں کی عملی تعبیر ثابت ہوا۔ مسلمان کو ، کانفرنس میں پہلی بار اس کا موقع ملا کہ وہ باہم تبادلہ خیال کے ذریعے اپنے قومی مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔ اس یکجائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی قومی زندگی میں ایک

انقلاب اور ان کے سیاسی شعور میں ایک تحرّک پیدا ہو گیا۔ بعد کو مسلم لیگ کا قیام، دراصل اسی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا توسیعی عمل تھا، جو لوگ اس کانفرنس کے تخیل کے محرک و بانی تھے اور جن کی کوششوں سے یہ ایک فعال جماعت بن گئی تھی ان ہی کی توجہ اور ان ہی کے ہاتھوں مسلم لیگ وجود میں آئی۔ اسی لئے دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلتی رہیں اور بہت دنوں تک ان کے سالانہ اجلاس بھی ایک جگہ اور ایک ہی وقت میں منعقد ہوتے رہے۔ مسلم لیگ کے قیام سے تین سال پہلے یعنی ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنی ایک اور شاخ "شعبہ علمیہ" کے نام سے قائم کر دی تھی اور مقصد کی صراحت کے لئے اس کا نام "انجمن ترقی اردو" رکھا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی اور پہلے صدر مسٹر آرنلڈ تھے[۳]۔ "انجمن ترقی اردو" کا قیام دراصل میکڈانلڈ کے اس قہر و غضب کا عملی جواب تھا جو اس نے اردو کے حق میں بپا کر رکھا تھا۔ مولانا شبلی کے اثر سے بہت سے اہل قلم انجمن کے رکن بن گئے اور وہ اردو کی مدافعت و ترقی کے لئے ایک محاذ کے طور پر کام کرنے لگے لیکن اس میں جان اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق اس کے سکریٹری مقرر ہوئے اور اس نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے الگ ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کر لی۔

اب برصغیر کے مسلمانوں کے پاس بعض صوبائی تنظیموں کے علاوہ قومی سطح پر تین بڑی جماعتیں تھیں۔

۱۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۶ء)

۲۔ انجمن ترقی اردو (۱۹۰۳ء)

۳۔ مسلم لیگ (۱۹۰۶ء)

ان میں بنیادی ادارہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تھا، ابتداً قومی سطح کے مسائل پر مسلمانوں نے اسی کے سالانہ جلسوں میں غور و فکر کیا، جب مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہونے لگے اور کانفرنس پر کام کا بوجھ بہت ہو گیا تو ہر مسئلے کے حل کے لئے الگ الگ اداروں کے قیام کا سوال پیدا ہوا۔ ہندی اور اردو کے قضیے میں حکومت کی کھلی ہوئی ناانصافی ہندو اکثریت کی جارحیت اور ہندی پرچارنی سبھا بنارس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے نتیجے میں "۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو قائم ہوئی اور اردو کی ترقی و ترویج اور حفاظت کا کام اس کے سپرد ہوا۔ کانگریس کی سیاسی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں سے نبٹنے کے لئے "مسلم لیگ" وجود میں آئی اور تعلیمی ترقی کے سلسلے کی ذمہ داریاں بدستور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پورا

کرتی رہی لیکن ان اداروں یعنی کانفرنس، مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو میں جو رشتہ اتحاد پہلے دن قائم ہوگیا تھا وہ آخر تک برقرار رہا۔ بہت دنوں تک مسلم لیگ اور کانفرنس کے سالانہ جلسے ساتھ ساتھ ہوتے رہے اور انجمن ترقی اردو جیسا کہ ابھی کہا گیا کانفرنس کی ذیلی شاخ کی حیثیت ہی سے بہت دنوں تک کام کرتی رہی۔

انجمن ترقی اردو کی الگ حیثیت قائم ہو جانے اور مسلم لیگ کے وجود میں آنے کے بعد یہ ضرور ہوا کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی زیادہ توجہ اپنے اصل کام یعنی مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کی طرف مبذول رہی لیکن چونکہ کانفرنس کے بنیادی کاموں میں تعلیم کی ہر سطح پر اور ہر جگہ اردو کو ترقی دینے، اسے کو ذریعہ تدریس بنانے اور اس کے علمی و ادبی معیار کو بلند کرنے کی ذمہ داریاں بھی شامل تھیں اس لئے کانفرنس کا کوئی عمل اور کوئی اقدام اردو کے دفاع اور اشاعت کی کوششوں سے خالی نہ تھا، البتہ اردو کی لسانی اور تاریخی حیثیتوں کو متعین کرنے، اس کے علمی و ادبی ذخیرے میں تیزی سے اضافہ کرنے، سیاسی نوعیت کی تحریکات و اصلاحات میں اردو کو جائز مقام دلوانے اور اسے اس کے دشمنوں سے بچانے، نیز عوامی سطح پر ہندی اردو تنازع میں اردو کی وکالت و پیروی کرنے کی بھاری ذمہ داریاں انجمن ترقی اردو کو سونپی گئیں، جنہیں مولوی عبدالحق نے ۱۹۱۲ء کے بعد بدرجہ اتم پورا کیا۔ سرسید احمد خان کی طرح مولوی عبدالحق بھی اردو کے لئے عمر بھر لڑتے رہے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو ہندی کا جو قضیہ، سرسید کے زمانے میں اٹھا تھا اور اس کی ابتدائی منزلوں میں سرسید نے جس سرگرمی سے حصہ لیا تھا، مولوی عبدالحق نے اسی سرگرمی سے اس قضیے کے آخری مرحلوں میں حصہ لیا اور جس مشن کو سرسید نے شروع کیا تھا، اسے مولوی صاحب نے تکمیل کو پہنچایا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اور انجمن ترقی اردو کے ساتھ ساتھ خالص سیاسی سطح پر اردو کے مقدمے کی پیروی مسلم لیگ نے اپنے ذمے لی۔ ۱۹۰۶ء میں جن لوگوں نے مسلم لیگ کی بنا ڈالی تھی اور جو لوگ اس کے پہلے اجلاس میں شریک ہوئے اور شروع شروع میں بڑے ذوق و شوق سے اس کے رکن بنے، ان میں بیشتر وہ تھے جو مسلم لیگ کے قیام سے پہلے بھی اردو کی حمایت میں پیش پیش رہ چکے تھے اور جنہوں نے اردو کے خلاف ہندو اور انگریز کی متحدہ کوششوں کا مقابلہ کیا تھا۔ بعد ازاں جب ملک گیر پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم کی گئی اور اس کی شاخیں مختلف صوبوں اور ضلعوں میں قائم کی گئیں تو ان ضلعی اور صوبائی مسلم لیگ کمیٹیوں کے اولین ارکان میں بہت سے وہی یا ان کے

خاندان کے دو لوگ تھے جو ۱۸۷۳ء میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن، الہ آباد اور ... میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن، لکھنؤ میں سرگرم حصہ لے چکے تھے۔ سی۔ اے۔ بیلی نے ہندو مسلم سیاست کی جڑوں کو الہ آباد کے ضلعے میں تلاش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

Syed Ahmad's Urdu Defence Association of 1873 had a central council composed of seventy-there Allahabad professional men and middling land owners. It claimed Government favour because of the historical importance of the community. This organization was significant because some of the descendants of the members of the central council of 1873 were associated with the Urdu Defence Association of 1899 and at least fifteen with Allahabad district Muslim League, after 1906. ٹ

اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن، الہ آباد اور لکھنؤ کے بعض اجلاسوں کی روداد اور ابتدائی ممبروں کی فہرست بھی ہماری نظر سے گزری ہے۔ ان کے بعض اجزا من و عن تاریخی دستاویز کے طور پر اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ بھی دے دئے گئے ہیں ان کے دیکھنے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ابتدائی اجلاسوں اور ان کے ممبروں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سی۔ اے۔ بیلی نے جو کچھ لکھا صحیح لکھا ہے۔ وہ ایک جگہ اور الہ آباد ضلع مسلم لیگ کے ذکر میں قدرے وضاحت سے لکھتا ہے کہ:

Its antecedents were the Urdu Defence Association of 1873, and 1900. Indeed, with the exception of Abdul Baqi Khan, contractor, and two others, the forbearers of all the thirty men who appeared as patrons of the local league in 1912, had been members of the central committee of Urdu Defence Association of 1873. ځ

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں میں مقبول اور ہر دلعزیز بنانے میں ابتداً زیادہ تر ایسی لوگوں نے حصہ لیا ہے جو اس سے پہلے اردو کے دفاع میں بھی سامنے رہ چکے تھے۔ ہونا بھی یہی چاہئے تھا اس لئے کہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کے ذریعے سیاسی سطح پر ہندوؤں سے یا آل انڈیا نیشنل کانگریس سے قومیت کے جس مسئلے کو بنیاد بنا کر اختلاف رائے کیا تھا اس میں مسلم قومیت کے ثقافتی و تہذیبی عناصر کو بڑا دخل تھا اور ان عناصر کی ترجمان و محافظ چونکہ عام طور پر اردو زبان تھی اس لئے ضروری تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنی جداگانہ قومیت کو منوانے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے ہر سطح پر اردو کے تحفظ کو اپنے مقاصد کا جزو خاص بناتے۔ مسلم لیگ نے یہی کیا۔ سیاسی سطح پر وہ

اردو کے سلسلے میں آخر تک لڑتی رہی اور اس مسئلے پر انجمن ترقی اردو اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے اس کا رشتۂ اتحاد ایسا استوار رہا کہ اس میں کبھی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ تینوں ادارے اپنی اپنی سطح پر اردو کے لئے جو کچھ بن سکا، کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۳۷ء کے کانگریس راج سے قبل تک تیس سال میں ان میں سے ہر ادارے نے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

ہندو اور کانگریسی لیڈر ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات سے بھی خوش نہ تھے۔ ان اصلاحات میں جو بات انہیں سب سے زیادہ ناگوار تھی وہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کو تسلیم کرنا تھا۔ چنانچہ اس کی مخالفت میں بھی ہر طرف سے شور برپا کیا گیا۔ عام ہندوؤں سے لے کر، ہندو سیاسی رہنماؤں اور مفکروں تک نے جداگانہ انتخاب کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ کے ایم پانیکر نے جداگانہ انتخاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> The institution of separate electorates for the Muslims, was the first expression of the pernicious Two-Nation Theory, which ultimately resulted in the foundation of Pakistan. India took over 40 years to get rid of this vicious system and that too at the cost of a partition.[۲]

گاندھی جی نے جداگانہ انتخاب کے بارے میں کہا کہ

"اس نے ہمیں تباہ کر دیا اگر یہ نہ ہوتا تو اب تک ہمارے [illegible] حل ہو جاتے۔"[۳]

پنڈت جواہر لال نہرو نے برصغیر کی سیاست میں جداگانہ [illegible] کو متنازعہ قرار دیتے ہوئے اس کو ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے لئے بھی [illegible] ثابت کرنے کی کوشش کی۔[۴] کانگریس کے پلیٹ فارم سے تقریروں اور قراردادوں کی صورت میں بار بار جداگانہ انتخاب کے اصول کو مطعون کیا گیا۔ ۱۹۰۹ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک لگاتار کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں اس کے خلاف تجویزیں منظور کی گئیں۔[۵] اور اسے جلد سے جلد منسوخ کرانے کی کوشش تیز سے تیز تر کر دی گئیں۔

اسی دوران یعنی ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا ایک حصہ سڑک چوڑی کرنے کے بہانے حکومت کے حکم سے منہدم کرا دیا گیا۔ چونکہ یہ اقدام ہندوؤں کے دباؤ سے سڑک پر واقع ایک مندر کو بچانے کے لئے لیا گیا تھا اس لئے مسلمانوں نے اس کی مزاحمت کی، حکومت نے گولی چلانے کا حکم دے دیا اور بہت سے مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ اس واقعہ نے برصغیر کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ علماء، وکلاء، سیاسی رہنما اور صحافی و

ادیب سارے مسلمانوں نے اس واقعے کے خلاف احتجاج کیا۔ حادثے کے زخمیوں کے لئے طبی اور شہیدوں کے ورثا کے لئے مالی امداد کے انتظامات کئے گئے۔ مسلم لیگ کی طرف سے مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن اس معاملے کو پارلیمنٹ کے ارکان تک پہنچانے کے لئے انگلستان گئے۔ لیکن کسی بات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ بجز اس کے کہ حکومت کی مسلمان دشمنی کے سبب مسلمانوں کے دل میں نفرت کے جذبات زیادہ گہرے ہو گئے۔

اسی دوران میں جبکہ تقسیم بنگال کی ناگہاں تنسیخ اور حادثۂ کانپور کے صدموں سے مسلمان نڈھال تھے۔ بیرون ملک بھی بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جو حکومت کے خلاف مسلمانوں کی بے اطمینانی و اضطراب کا سبب ہوئے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر، جہاں تیرہ سو سال سے ترکوں کی حکومت قائم تھی، بغیر کسی سبب کے اچانک حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ترکوں کی ہمدردی میں اٹلی کے سامان کا بائیکاٹ کیا، اخبارات میں کالم اور مضامین لکھے، مالی امداد کے لئے چندہ جمع کیا، ابھی طرابلس کے سلسلے میں ترکی اور اٹلی کی جنگ جاری ہی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں نے متحد ہو کر ترکی پر حملہ کر دیا، مقصد یہ تھا کہ ترکی اور اسلام کو یورپ کی سرزمین سے بالکل خارج کر دیا جائے۔ ترکی پر یہ حملے یورپین ریاستوں اور برطانیہ کی ساز باز سے ہوئے تھے اس لئے ترکی کے خلاف حکومت کا یہ اقدام مسلمانوں کی ناراضگی کا سبب ہوا۔ اس موقع پر بھی برصغیر کے مسلمانوں نے ترکوں کی ہمدردی اور برطانیہ کے رویے کے خلاف آواز بلند کی۔ مولانا شوکت علی نے مولانا عبدالباری کے تعاون سے ۱۹۱۳ء میں "خدام کعبہ" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، جس کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ "اسلام کے اماکن مقدسہ مکہ مدینہ اور بیت المقدس کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں جانے سے بچانے اور اگر ایسا موقع آجائے تو اس مقصد کے حصول کے لئے ہر طرح کی قربانیاں پیش کرنے کے عزم صمیم پر مسلمانوں کو متحد کرے"[۱۰۹]

۱۹۱۴ء میں برطانیہ اور جرمنی کے درمیان پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جس میں ترکی باقاعدہ جرمنی کا حلیف بن گیا[۱۱۰]۔ گویا بالواسطہ برطانیہ اور ترکی کے درمیان بھی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس سے مسلمانان برصغیر بڑے اضطراب میں مبتلا ہو گئے۔ اس موقع پر لندن ٹائمز نے "ترکوں کی پسند" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا اور اس میں ترکی کو حد درجہ توہین آمیز لہجے میں جنگ سے الگ رہنے کا مشورہ دیا اس کے جواب میں "کامریڈ" کے ایڈیٹر مولانا محمد علی جوہر نے اسی عنوان سے ایک بھرپور مقالہ لکھا اور ترکوں کو اپنے

موقف میں حق بجانب بتایا۔ اس پر مولانا جوہر کو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے مسلمان رہنماؤں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا۔ مسلمانوں کے اہم اخبارات مثلاً کامریڈ، ہمدرد، زمیندار، الہلال اور البلاغ سب بند کر دئے گئے۔ اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان، انگریزوں سے متنفر ہوتے گئے اور اس طرح خود بخود ہزار اختلاف کے باوجود ہندو اور مسلمان کے درمیان اتحاد کی راہ ہموار ہو گئی اگرچہ یہ اتحاد دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں بمقام بمبئی کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس منعقد ہوئے اور آئندہ برصغیر کی آزادی کے لئے مل کر کام کرنے کی تجویزیں طلب کی گئیں۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں ان تجویزوں کو کلکتہ میں آخری شکل دی گئی اور دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنے اپنے سالانہ اجلاسوں منعقدہ لکھنو میں ان تجویزوں کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا۔ یہی معاہدہ تحریک پاکستان کی تاریخ میں "میثاق لکھنو" یا "لکھنو پیکٹ" کے نام سے مشہور ہے اس معاہدے کی دو دفعات مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بہت اہم تھیں:

(الف) مرکزی اسمبلی کے منتخب ممبروں میں ایک تہائی ارکان مسلمان ہونگے۔

(ب) ممبروں کا انتخاب جداگانہ انتخاب کے اصول پر ہوگا اور مسلمان اپنے نمائندوں کا انتخاب خود کریں گے

ان میں آخری دفعہ کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ حکومت نے اگرچہ جداگانہ انتخاب کے اصول کو ۱۹۰۹ء میں مان لیا تھا لیکن کانگریس اور ہندو رہنما، برابر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ کا یہ پہلا موقع تھا کہ کانگریس نے بھی "میثاق لکھنو" کے ذریعے مسلمانوں کے اس پرانے مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ یہ مسلمان کی سیاسی جدوجہد کی دوسری بڑی کامیابی تھی۔

میثاق لکھنو کے بعد ہندو اور مسلمان کی کوششوں سے برصغیر کے مطالبۂ آزادی میں تازہ جان پیدا ہو گئی۔ جنگ عظیم کے موقع پر، مقامی باشندوں نے اس وعدے پر برطانیہ کے ساتھ تعاون کیا تھا اور اس کی فوجی مہمات میں حصہ لیا تھا کہ جنگ کے بعد اہل ہند کو حق خود اختیاری دینے میں تامل نہ کیا جائے گا، لیکن لڑائی میں جرمنی کی شکست کے بعد حکومت کی نظریں بدل گئیں، آئینی اصلاحات جاری کرنے کی تجویزیں پارلیمنٹ میں ضرور پیش ہوئیں اور جون ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات یا "قانون حکومت ہند" کے نام سے انہیں جاری بھی کر دیا گیا لیکن جو مراعات دی گئی تھیں وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی

توقعات سے بہت کم تھیں، اس لئے ان سے عوام میں حکومت کا اعتماد کیا بحال ہوتا، الٹا بد دلی اور نفرت میں اضافہ ہو گیا

انہیں ایام میں ترکی خلافت کو بحال کرانے اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ خلافت کمیٹی اپنے خاص عہد میں، مسلم لیگ اور کانگریس سے بھی زیادہ فعال جماعت رہی اور دو سال کی قلیل مدت میں، ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ایسا اہم کردار ادا کیا کہ برطانوی حکومت اسے اپنے حق میں ایک طرح کا خطرہ محسوس کرنے لگی۔ خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس مولوی فضل الحق کی صدارت میں بمقام دہلی نومبر ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا[۱۰]۔ اس میں کہا گیا کہ جرمنی اور ترکی کے خلاف برطانیہ کے جشن فتح مندی میں مسلمان اس وقت تک شریک نہیں ہوں گے جب تک ان کے مطالبات تسلیم نہ کر لئے جائیں۔ چونکہ مسلمانوں کے ساتھ، اس تحریک میں ہندو بھی شریک ہو گئے تھے۔ اور ترک موالات کے ریزولیوشن کے تحت کانگریس بھی حکومت سے عدم تعاون کر رہی تھی اس لئے خلافت تحریک نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسی زمانے میں برصغیر کے بعض حریت پسندوں مثلاً مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمود الحسن شیخ الجامعہ دیوبند، مولوی برکت اللہ، شیام جی کرشن ورما، لالہ ہردیال اور مہندر پرتاب وغیرہ نے ہندوستان سے باہر جا کر دوسرے ملکوں کی مدد سے ہندوستان کو حکومت برطانیہ کی غلامی سے نجات دلانے کی کوششیں کیں۔ یہ کوششیں اس وقت تو بظاہر ناکام رہیں تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کوششوں کے نتیجے میں آگے چل کر برصغیر کی آزادی کے لئے راہیں تیزی سے ہموار ہو سکیں۔ بقول مولانا حسن ریاض

> "اس تحریک سے برصغیر کے مسلمانوں نے حکومت کے مقابلے میں اپنے دعووں پر اصرار کرنا سیکھا۔ ان میں سیاسی فکر پیدا ہوئی۔ ان کے مذہبی تصورات بیدار ہوئے۔ غیر ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ ان کے روابط قائم ہوئے اور بیرونی ممالک میں ان کا وقار بڑھا۔ اردو زبان، ہندوستان کے بعید ترین گوشوں میں بولی اور سمجھی جانے لگی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان اس سے رشتہ اخوت استوار ہو گیا۔"[۱۱]

لیکن ہندو اور مسلمانوں کا یہ اتحاد زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ خلافت تو یوں دم توڑنے لگی کہ خود ترکی حکومت نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں اپنے یہاں سے خلافت کا

خاتمہ کر دیا۔ دوسری طرف تحریک خلافت اور ترک موالات کی تحریکات نے عوام کو اتنا پر جوش بنا دیا تھا کہ موپلوں کی بغاوت اور چورا چوری کا حادثہ رو نما ہو گیا۔ موپلے، بمبئی کے ساحلی علاقے مالا بار کے عربی النسل باشندے ہیں۔ خلافت تحریک میں انہوں نے بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا اور جب حکومت نے پکڑ دھکڑ شروع کی تو وہ حکومت کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے میدان میں نکل آئے۔ ان کی تعداد بھی تھوڑی تھی اور اسلحہ بھی نہ تھا۔ حکومت نے فوجی کارروائیوں کے ذریعے انہیں کچل کر رکھ دیا۔ ادھر گورکھپور کے ایک موضع چورا چوری کے عوام نے اشتعال میں آکر ایک پولیس چوکی کو آگ لگا دی اور اس میں کئی سپاہی جل کر خاک ہو گئے۔ ان تشدد آمیز واقعات کی طرف حکومت نے سختی سے توجہ کی اور بے شمار آدمیوں کو مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔ گاندھی اور کانگریس کے دوسرے رہنماؤں نے ان واقعات کو بہانا بنایا اور انگریزوں کے اشارے پر ترک موالات و عدم تعاون کی تحریک سے یوں ہاتھ کھینچ لیا کہ حکومت نے بڑی گہری سیاسی چالوں کے ساتھ، ہندو مسلم اتحاد کے زمانے میں برطانیہ کے خلاف ہونے والے ہنگاموں اور واقعات کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی اور ہندو زعمانے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے حکومت کی ہم نوائی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہی ہندو جو ہندو مسلم اتحاد کا دم بھرتے تھے اور جن پر اعتماد کر کے بعض سے مسجدوں میں تقریریں کروائی گئی تھیں، مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

ہندو مسلم اتحاد کی علامت کے طور پر کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۲ء تک ساتھ ساتھ ہوئے[۱۵]۔ لیکن اب یہ صورت باقی نہ رہی، کانگریس اور مہا سبھا کے بعض لیڈروں کی انتہا پسندانہ کارروائیوں نے مسلمانوں اور ان کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو اپنی صفوں کو دوبارہ اپنے طور پر منظم کرنے پر مجبور کر دیا۔ حکومت کی سختیوں کے سبب، عوام میں برطانوی اقتدار سے نفرت بڑھتی گئی اور ہر سیاسی جماعت کی طرف سے آزادی کا مطالبہ شدت اختیار کرتا گیا، چنانچہ سیاسی اصلاحات کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے حکومت نے سائمن کمیشن قائم کیا چونکہ اس کمیشن میں کوئی مقامی ممبر شامل نہ تھا اس لئے ہر سیاسی جماعت نے اس کا بائیکاٹ کیا، اس پر برطانوی وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو یہ دعوت دی کہ حکومت کی جاری کردہ اصلاحات پر ہمیشہ تنقید کرنے کے بجائے وہ خود کوئی دستور بنا کر پیش کریں۔ اس دعوت کو قبول کر لیا گیا اور مارچ ۱۹۲۸ء میں پہلی آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں طلب کی گئی، کچھ امور طے پائے اور کچھ پر غور کرنے

کے لئے ملتوی شدہ اجلاس ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں بلایا گیا۔ اس میں مسلمان
ممبروں کی مخالفت کے باوجود، ہندوستان کا آئندہ دستور مرتب کرنے کے لئے پنڈت موتی
لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جو کہ "نہرو رپورٹ"
کے نام سے مشہور ہے۔ جیسے ہی مکمل ہوئی اگست ۱۹۲۸ء میں اس پر غور کرنے کے
لئے پھر آل پارٹیز کانفرنس طلب کی گئی، مسلمانوں کے دونوں اہم رہنما یعنی مولانا محمد علی
جوہر اور محمد علی جناح انگلستان میں تھے، پھر بھی مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت نے
اس کانفرنس کے مباحث میں حصہ لے کر مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔ دونوں نے
نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کی توقعات کے بالکل برعکس بتایا۔ بایں ہمہ نہرو رپورٹ من و عن
منظور کر لی گئی اور اس کی توثیق کے لئے کلکتے میں آل پارٹیز کنونشن بلایا گیا اس میں مولانا
جوہر نے خلافت کمیٹی کے نمائندے اور محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے نمائندے کی
حیثیت سے شرکت کی اور بہت سی ترمیموں کے لئے تجویزیں پیش کیں، لیکن ایک بھی نہ
سنی گئی۔ دونوں، نہرو رپورٹ سے حد درجہ مایوس ہوئے۔ بعد میں آل پارٹیز مسلم
کانفرنس میں مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء ہند اور دوسری مسلم جماعتوں کی طرف
سے متفقہ طور پر نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کے مفادات کے خلاف بتایا گیا۔

نہرو رپورٹ سے مسلمانوں کے اختلاف کا خاص سبب یہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہر
اور قائد اعظم کی کوششوں سے مختلف مکتبہ خیال کے مسلمانوں نے اتفاق رائے سے جو
چودہ نکات آئندہ آئینی اصلاحات میں شمولیت کے لئے منظور کئے تھے اور جنہیں آل انڈیا
کانگریس کمیٹی نے بھی ۱۵ مئی ۱۹۲۷ء کے اجلاس (بمبئی) میں تسلیم کر لیا تھا۔ وہ نکات،
کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس (دسمبر ۱۹۲۷ء) میں گاندھی جی کے اشارے پر نظر
انداز کر دئے گئے اور بعد میں آل پارٹیز کانفرنس اور نہرو رپورٹ میں بھی انہیں لائق توجہ
نہیں سمجھا گیا۔ ایسا دو سبب سے ممکن ہو سکا ایک یہ کہ مسلمانوں کی صفوں میں اس وقت
سخت انتشار تھا اور ان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ۔ خود بھی دو ٹکڑوں میں
بٹی ہوئی تھی، دوسرے یہ کہ آل انڈیا مہاسبھا، اس وقت تک مضبوط سیاسی جماعت کی
حیثیت سے سامنے آگئی تھی، اور انڈین نیشنل کانگریس[۱۲] ملم لیگ کے بجائے مہاسبھا
کی سیاسی قوت کا سہارا لینا مفید و ضروری خیال کیا تھا۔ لیکن کانگریس اور ہندو مہاسبھا کا یہ گٹھ
جوڑ جو "نہرو رپورٹ" کی شکل میں سامنے آیا، مسلمانوں کو چونکانے میں مددگار ثابت ہوا۔
اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے مختلف اجلاس پے در پے

طلب کیئے گئے اور نہرو رپورٹ کو متحدہ طور پر رد کر کے، قائد اعظم کے پیش کردہ چودہ نکات کو تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی لیکن مسلمانوں کے اس متحدہ مطالبے کو ہندو اکثریت اور اس کی نمائندہ کانگریس نے کوئی اہمیت نہ دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد جو پچھلے چند برسوں میں مثالی صورت اختیار کر گیا تھا ہمیشہ کے لئے پارہ پارہ ہو گیا، کے کے عزیز نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

"خلافت تحریک کے ختم ہوتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کا مختصر ہنی مون (HONEY MOON) ختم ہو گیا اور مخالفت و عناد نے ایک بار پھر سر اٹھایا لیکن اب کے اس میں شدت زیادہ تھی اور دوبارہ یکجا ہونے کے امکانات نہ تھے۔ نہرو رپورٹ نے اس کشیدگی پر مہر لگا دی اور ہندوستان میں امن ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔"[۱]

ادھر کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ اگر "نہرو رپورٹ" کو حکومت نے نامنظور کیا تو پورے ملک میں سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی، چنانچہ مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی قیادت میں اس تحریک کا آغاز ہو گیا، بہت سے سیاسی رہنما جیل گئے اور پورے ملک میں ایک شورش برپا ہو گئی لیکن مسلم لیگ اور اس کے رہنما اس سے الگ تھلگ رہے۔
اب برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن کی رپورٹ اور نہرو کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں کسی تصفیے تک پہنچنے کے لئے نومبر ۱۹۳۰ء میں ایک گول میز کانفرنس طلب کی۔ کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کیا، البتہ دوسری گول میز کانفرنس میں جو کہ، ستمبر ۱۹۳۱ء سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی، کانگریس نے شرکت کی۔ لیکن گاندھی جی کی ضد کے سبب یہ گول میز کانفرنس بھی نتیجے کے اعتبار سے ناکام رہی، اب حکومت نے اپنے طور پر اگست ۱۹۳۲ء کو "کمیونل ایوارڈ" کے نام سے ایک آئینی اصلاحی ڈھانچے کا اعلان کر دیا۔ اس میں مسلمانوں کے پرانے مطالبے "جداگانہ انتخاب" کو برقرار رکھا گیا اور جن صوبوں میں مسلمان یا ہندو اقلیت میں تھے وہاں وہاں انہیں ویٹیج کے تحت زیادہ نمائندگی دے دی گئی اس پر بھی کانگریس کی طرف سے شور غوغا بلند ہوا۔ گاندھی جی نے مرن برت رکھا۔ آخر کار نومبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس بلائی گئی، کانگریس نے اس میں بھی شرکت نہ کی تو حکومت نے تینوں کانفرنسوں کی سفارشات پر مبنی جولائی ۱۹۳۵ء میں ایک آئین جاری کر دیا جو "ایکٹ آف ۱۹۳۵ء" کے نام سے مشہور ہوا۔

بیسویں صدی کا آغاز اردو پر ہندی کی فتح مندی سے ہوا تھا۔ سی پی، بہار اور یوپی کی

عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں ناگری اور ہندی کو باریابی حاصل ہو گئی تھی، اور اب ہندوؤں کی کوششیں یہ تھیں کہ ہندی کو پورے بر صغیر کی لینگوافرینکا تسلیم کرایا جائے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن، الہ آباد، ہندی پرچارنی سبھا، بنارس اور آل انڈیا ہندو مہا سبھا نے کھل کر یہ کام شروع کر دیا تھا۔ کانگریس کے بعض لیڈر مثلاً پنڈت مدن موہن مالویہ تو خیر ہندی کے پرچار کے لئے تیغ بکف نکلے ہی ہوئے تھے اور مذکورہ بالا چاروں جماعتوں کے سرگرم رکن تھے[۱۸]۔ لیکن دوسرے کانگریسی لیڈروں کا نقطہ نظر بھی زبان کے سلسلے میں مالویہ جی سے مختلف نہ تھا۔ مالویہ جی کی طرف سے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے موقع پر یہ کوشش کی گئی کہ زبان کے کالم میں ہندوؤں کے لئے "ہندی" اور مسلمانوں کے لئے "اردو" لکھا جائے۔ مالویہ جی کا اس کوشش سے درپردہ مقصد یہ تھا کہ:

> "ہندی کو سرکاری سطح پر ہندوؤں کی زبان، دوسرے لفظوں میں بر صغیر کی اکثریت کی زبان تسلیم کرالیا جائے"۔

لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا کے مصنف ڈاکٹر گریرسن نے جو کہ مردم شماری کمیشن کے چیرمین تھے اس مطالبے کو تسلیم نہ کیا اور "ہندی" "اردو" کے بجائے زبان کے کالم میں "ہندوستانی" کے لفظ کا اندارج کرایا[۱۹]۔

لسانی اور سیاسی جماعتوں کے علاوہ، ہندو مذہب اور قومیت کی دو اصلاحی تحریکیں آریہ سماج اور سناتن دہرم، ہندی کی تبلیغ میں سب سے نمایاں اور جارح کردار ادا کر رہی تھیں، انہوں نے صرف یہی نہیں کہ ہندی کے فروغ کو اپنے مقاصد خاص میں شامل رکھا بلکہ سوامی دیانند سرسوتی نے "ہندی" کو "آریہ بھاشا" سے موسوم کر کے، اس کی اشاعت و ترقی کو ہندو کا مذہبی فریضہ قرار دے دیا[۲۰]۔ ہندی ساہتیہ سمیلن نے سالانہ جلسوں کے اہتمام کے علاوہ جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں اور پنڈت مدن موہن مالویہ، سمپورنانند، پرشوتم داس ٹنڈن، کاکا کالیکر، وی ڈی ساورکر، اور ہردیال جیسے انتہا پسند ہندو قومیت پرست لیڈروں نے، دیوناگری اور فارسی رسم الخط کی بحثوں سے آگے بڑھ کر ہندی کو پورے ہندوستان کی قومی زبان بنانے کی مہم چلائی۔ کانگریس کے اعتدال پسند لیڈروں میں گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، اور راجندر پرشاد وغیرہ نے بھی اس مسئلے سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا لیکن کانگریسی رہنماؤں کی کوششیں، عام طور پر گاندھی جی کے اشاروں اور ان کی لسانی حکمت عملی کی تابع رہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گاندھی جی، کانگریس اور ہندوؤں کے پہلے بڑے رہنما تھے، جنہوں نے بر صغیر کے سیاسی مسائل میں لسانی مسئلے کو بھی اہم

خیال کیا اور اس موضوع پر وہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لے کر قیام پاکستان تک کچھ نہ کچھ کہتے رہے، سب سے پہلے انہوں نے ۱۹۱۷ء میں گجرات ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"برصغیر کی قومی زبان بننے کی اہل صرف ہندی ہے اور ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو ناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔"[۲۱]

۱۹۱۸ء میں ساہتیہ سمیلن کی صدارت کرتے ہوئے بھی انہوں نے اسی موقف کو دھرایا[۲۲] اور ہندی اور اردو کے لئے ایک مشترک نام "ہندوستانی" کا استعمال کرنے لگے۔ اس موقف میں ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ہندی کو ناگری رسم الخط میں کچھ دنوں کے بعد مقبولیت حاصل ہو جائے گی اور وہ اکثریت کی زبان بن جائے گی اور اردو خود بخود اپنی وہ حیثیت کھو بیٹھے گی جو اسے حاصل ہے۔ چنانچہ گاندھی جی کے اشارے پر ۱۹۲۵ء میں[۲۳] کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں، یہ قرارداد منظور کی گئی کہ آئندہ ہندوستان کی قومی زبان یا لنگوافرینکا، "ہندوستانی" ہوگی۔ اور وہ "ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی"۔ کانگریس اور گاندھی جی نے اس قرارداد میں بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ نام کی تبدیلی سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان زبان کے مسئلے پر جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور چونکہ اکثریت ناگری کو استعمال کرے گی اس لئے اردو کی برتری بتدریج ختم ہو جائے گی لیکن کانگریس کی اس قرارداد سے نہ ہندو مطمئن ہوئے اور نہ مسلمان۔ مسلمانوں نے اصولی طور پر بات تو مان لی لیکن معروف و مستقل نام "اردو" کو ہٹا کر "ہندوستانی" کی ایجاد ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی، ان کا خیال تھا کہ یہ غیر ضروری تبدیلی کسی نہ کسی سیاسی مصلحت کے تحت کی گئی ہے اور یہ خیال غلط نہ تھا لیکن مشکل یہ ہوئی کہ کانگریس کے انتہا پسند ارکان اور ہندوؤں کی دوسری سماجی و مذہبی جماعتیں جو کہ بزعم اکثریت اردو کی جگہ "ہندی" کو بالا علان اور جلد سے جلد پورے ملک کی قومی زبان بنا دینا چاہتی تھیں، وہ بھی قرارداد سے خوش نہ ہوئیں۔ بقول سجاد ظہیر وہ یہ کہتے تھے کہ:

"ہمیں ڈر ہے کہ ہندوستانی کا مبہم نام لے کر ملک پر اردو نہ ٹھونس دی جائے۔"[۲۴]

نتیجتاً ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے "ہندوستانی" کے سلسلے میں خدشات کا اظہار کیا گیا اور گاندھی جی سے "ہندوستانی" کی وضاحت چاہی گئی۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر کی باتوں میں لوگوں کو ٹالتے رہے اور زبان کے معنی میں لفظ "ہندوستانی" کی قدامت ثابت کر

کے نہ جانے کیا کیا سمجھاتے رہے۔ اس موضوع پر انہوں نے صرف یہی نہیں کہ جگہ جگہ تقریریں کیں اور اخبارات کو بیان دئے بلکہ "ینگ انڈیا" اور "ہنس" میں لگاتار کئی مضامین بھی لکھے۔ ان مضامین کو اگست ۱۹۴۲ء میں آنند ٹی ہنگورانی نے کراچی سے "اور لینگویج پرابلم" کے نام سے شائع کر دیا ہے اس میں پہلا مضمون "کل ہند رسم الخط" کے عنوان سے ہے اور یہ پہلے پہل ۱۴ جولائی ۱۹۲۷ء کے "ینگ انڈیا" میں چھپا تھا۔[۲۵] اس میں گاندھی جی نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ مختصراً یہ تھے:

"ہندوستان کی ساری زبانوں کے لئے صرف ایک رسم الخط ہونا چاہئے اور اس کے لئے موزوں ترین رسم الخط دیوناگری ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کا اختلاف یقیناً اس کی راہ میں حائل ہوگا لیکن ناگری کو ہر دل عزیز اور سب کے لئے قابل قبول بنانے تک یہ ضروری ہے کہ ہندوستان میں مروج ساری سنسکرت آمیز زبانوں کو ایک رسم الخط میں لکھنے کے لئے لوگوں کو ذہنی طور پر آمادہ کیا جائے۔ ابھی تک بنگالی پنجابی، سندھی، اڑیا، گجراتی، تلگو، تامل اور مالیالم وغیرہ مختلف حروف میں لکھی جاتی ہیں، اگر یہ سب ایک رسم الخط یعنی دیوناگری میں لکھی جائیں تو ہندو انڈیا کے مختلف صوبوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے میں آسانی ہو جائے گی۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ جو مشترک رسم الخط آسانی سے اپنایا جا سکتا ہو اپنا لیں اور اس کے لئے موزوں ترین دیوناگری ہی ہے۔ یہ کام اگرچہ ہو رہا ہے لیکن رفتار بہت سست ہے، جب تک ہندو اور مسلمانوں کے جذبات ایک دوسرے کے خلاف بھڑکے ہوئے ہیں، ناگری اور فارسی رسم الخط دونوں چلتے رہیں گے۔ کچھ دنوں بعد جیسے جیسے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے، دونوں رسم الخط خود بخود ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک بن جائیں گے، میں نے دیکھا ہے کہ اس قسم کی کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔ گیتا انجلی، دیوناگری میں چھاپی گئی ہے لیکن اس کام کو وسیع پیمانے پر ہونا چاہئے۔ جو لوگ ہندو مسلم اتحاد پر یقین رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ اس مسئلے پر غور کریں = ہندو اردو سیکھیں اور مسلمان ہندی۔"[۲۶]

اس خلاصے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زبان اور رسم الخط کے سلسلے میں گاندھی

جی کا جھکاؤ کس طرف تھا؟ وہ کوئی ایسا نسخہ تلاش کرنا چاہتے تھے جس سے اردو کو ختم کر کے ہندی کو رائج کیا جائے لیکن اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ مسلمانوں کو اس کا احساس نہ ہونے پائے اور وہ کانگریس کے ساتھ متحدہ ہندوستان کی آزادی کا نعرہ لگا کر، ہندوؤں کو اپنی خوشی سے اپنے اوپر آپ مسلط کر لیں۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ گاندھی جی، اپنی نیت کو بہت دنوں تک لوگوں کی نظروں سے چھپائے نہ رہ سکے۔ "ہندی ساہتیہ سمیلن" نے اپنے ایک اجلاس میں کانگریس کی منظور کردہ قرارداد میں "ہندوستانی" کی جگہ "ہندی ہندوستانی" کر دیا اور ۱۹۳۵ء میں بمقام اندور، ساہتیہ سمیلن کا جو سالانہ اجلاس خود گاندھی جی کی صدارت میں ہوا اس میں اس کی توثیق کر دی۔ گویا گاندھی جی نے ۱۹۲۵ء میں اردو یا ہندی کے بجائے "ہندوستانی" کو اور ۱۹۳۵ء میں "ہندوستانی" کے بجائے "ہندی ہندوستانی" کو برصغیر کی مشترک زبان قرار دیا۔ یہ تبدیلی معمولی نہ تھی اس نے ہندوؤں کے عزائم اور گاندھی جی کی چالوں کو پوری طرح واضح کر دیا اور اس کے بعد زبان کے مسئلے نے ایسی سنگین صورت اختیار کر لی کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے بہت صحیح لکھا ہے کہ

"Sammelan unfortunately modified the resolution of the Congress and suggested that Hindi-Hindustani should be lingua franca of India. The decision created a great deal of stir, specially among the nationally minded Muslims, who keenly desired a settlement but were disappointed by the resolution. At Indore the decision of Sahitya Sammelan was confirmed with the result that the communal tangle became much worse. The establishment of the Hindi Parchar Sabha and the intensification of attempts to propagate Sanskritized Hindi, led to a reaction and the Muslim League decided that Urdu should be considered the lingua franca of India."[۲۷]

ہندی ساہتیہ سمیلن اندور کے اجلاس (۱۹۳۵ء) میں کانگریس کی قرارداد میں جو ردوبدل ہوا وہ گاندھی جی کے خاص منشا سے ان ہی کی صدارت میں ہوا اور اس پر انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ ۴ مئی ۱۹۳۵ء کے "ہریجن" میں انہوں نے لکھا

"The Hindi Sahitya Sammelan, recently held at Indore passed some useful resolutions. Among them was one, giving a definition of Hindi and other expressing the opinion that all the languages that had descended from or had been largely influenced by Sanskirt should be written in Dewnagri script. The

authorized script of the Sammelan still remains Dewnagri'. The propagation of the Dewanagri script among Hindus of the Punjab, as elsewhere, will still continue. The resolution in no way detracts from the value of Dewnagri script." ؎۲۸

ہندی ساھتیہ سمیلن، اندور کے جلسے میں جو تجویزیں، ہندی اور ناگری کے سلسلے میں منظور کی گئی تھیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی، خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں، یہ فیصلہ معقول تھا، لیکن ان صاحبوں کے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا جن کا منشا کچھ اور تھا، انہوں نے اس ریزولیوشن کو وقعت نہ دی اور دوسری ادھیڑ بن میں لگ گئے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ اپریل ۱۹۳۵ء میں ظہور میں آیا یعنی سمیلن کا سالانہ جلسہ اندور میں منعقد ہوا جس کی صدارت مہاتما گاندھی نے فرمائی۔ اسی جلسے میں بالاتفاق یہ قرارداد منظور ہوئی۔

"ہندوستان کے ان ادیبوں میں جو اپنے اپنے صوبوں کی زبان میں کام کر رہے ہیں، ارتباط پیدا کرنے کی غرض سے نیز ہندی زبان کے ارتقا میں ان کا اتحاد حاصل کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس اصحاب ذیل کی ایک کمیٹی قائم کرتی ہے ۔۔

چنانچہ اس کمیٹی نے فوراً کام شروع کر دیا اور ماھانہ ہندی رسالہ "ھنس" اس ادارے کے تحت آگیا، یہ ادارہ "بھارت ساھتیہ پریشد" کے نام سے مشہور ہے (یعنی انجمن ادب ہند) اور "ھنس" اب اس کا رسالہ ہے۔ منشی پریم چندر کے ساتھ گجراتی زبان کے مورخ و ادیب مسٹر کنہیالال منشی اس کی اڈیٹری میں شریک ہو گئے۔ مہاتما گاندھی جی اس تحریک کے دینی باپ اور مسٹر کنہیالال اس کے روح رواں ہیں ؎۲۹

گویا، ہندی ساھتیہ سمیلن کے تعاون سے بلکہ اس کی نگرانی میں گاندھی جی نے ہندی کے فروغ کے لئے ایک اور نئی انجمن "بھارت ساھتیہ پریشد" کے نام سے قائم کر دی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے ہر علاقے کے ادیبوں کو اس کا ممبر بنایا جائے اور انہیں یکجا کر کے، ان قراردادوں کی توثیق کرائی جائے جو ہندی کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں ہندی ساھتیہ سمیلن نے منظور کی تھیں، چنانچہ اس کام کے لئے ۲۴۔۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں ایک اجلاس بلایا گیا اور ہر زبان کے ادیبوں کو اس میں شرکت

کی دعوت دی گئی، جس جس نیت اور جس غرض سے بلایا گیا تھا۔ اس اعتبار سے اس میں مدعو کئے جانے والے اور شرکت کرنے والے عموماً وہی لوگ تھے جو زبان کے مسئلے میں، ہندی ساہتیہ سمیلن اور " بھارت ساہتیہ پریشد " کے ہم خیال تھے۔ پھر بھی اس میں اردو کے متعدد ادیبوں نے شرکت کی جن میں انجمن ترقی اردو کے مولوی عبدالحق خصوصیت سے قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے اس کی بحثوں میں پورا حصہ لیا اور اردو والوں کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔

اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیکر نے " بھارت ساہتیہ پریشد " کا پس منظر و مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس انجمن کا خیال پہلے پہل ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹ ساہتیہ سمیلن منعقد بڑودہ میں پیدا ہوا تھا۔ کراچی میں کانگریس کے اجلاس کے موقع پر بھی مسٹر کنہیالال منشی سے اس مسئلے پر میری بات ہوئی تھی۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی جسے عمل میں لانے کے لئے کنہیالال منشی، ہری ہر شرما اور گردھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی، اس انجمن کے دو خاص مقصد قرار پائے:

۱۔ ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔

۲۔ اس سبھا کا کام، ہندی ہندوستانی میں ہوا کرے گا۔[۳۰]

مولوی عبدالحق کے بیان کے مطابق بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا پہلا اجلاس، ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء صبح دس بجے شروع ہوا، کاکا کالیکر کے استقبالیہ خطبہ کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس حاضرین میں تقسیم کر دیا گیا اور گاندھی جی نے اس سے الگ زبانی تقریر کی۔ تقریر کے بعد زیادہ تر بحث دوسرے ریزولیوشن کے الفاظ " ہندی یعنی ہندوستانی " پر ہوئی، جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ کانگریس کے ریزولیوشن میں تو قومی زبان کو صرف " ہندوستانی " سے موسوم کیا گیا تھا، اب اسے " ہندی ہندوستانی " کہا جا رہا ہے تو گاندھی جی نے فرمایا۔ " کانگریس کا ریزولیوشن بھی میں نے ہی بنایا تھا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے کہا۔ " لیکن اس وقت یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ہندوستانی کے معنی ہندی کے ہیں۔[۳۱] گاندھی جی نے جواب دیا۔ " اب میں نے اس کے معنی بتا دئے ہیں۔ " جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ۔ " ہندی ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟ " تو فرمایا۔ " وہ ہندی جو آگے۔

چل کر ہندوستانی ہونے والی ہے ..

مولوی عبدالحق نے "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے اجلاس کی تفصیلی روداد اسی وقت اپریل ۱۹۳۶ء کے رسالہ "اردو" میں شائع کر دی تھی۔ بعد کو یہ کئی موقر اردو پرچوں میں نقل ہوئی ہے[۳۲]۔

"بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے جلسے میں مولوی عبدالحق کے ساتھ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بھی شرکت کی تھی اور "ہندی ہندوستانی" کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے بعض ترمیموں کا مطالبہ کیا تھا لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ "ہندی ہندوستانی" کو ناگری میں قومی زبان بنانے اور اسے زندگی کے ہر شعبے میں بروئے کار لانے کی تجویز من مانے طور پر منظور کر لی گئی۔ ہندوؤں کے سارے مذہبی اور سیاسی حلقوں کی طرف سے ان فیصلوں کو سراہا گیا، کاکا کالیکر نے تو جلسے ہی میں اعلان کر دیا کہ "جن لوگوں نے اس تحریک کی ابتدا کی ہے انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا ہندی ہندوستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستانی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے۔ علاوہ ازیں اس جلسے میں جو فیصلے ہونے والے تھے ان سے کانگریس کے لیڈر اور ممتاز ہندو پہلے ہی سے باخبر تھے .. بابو راجندر پرشاد نے ہندی ساہتیہ سمیلن ناگپور کی صدارت کرتے ہوئے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے اور اس کا پہلا اجلاس اسی ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ ہندی پرچار میں مدد ملے گی[۳۳]۔

بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے پہلے اجلاس منعقدہ ناگپور کے سلسلے میں جامعہ ملیہ، دھلی کے پروفیسر محمد مجیب کا ایک خط بھی قابل ذکر ہے، یہ طویل خط انگریزی زبان میں، مہاتما گاندھی کے نام تھا اور جلسے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے پڑھ کر سنایا تھا۔ اس خط میں اردو، ہندی، ہندوستانی اور رسم الخط کے متعلق بہت اہم سوال اٹھائے گئے تھے اور بڑے مدلل انداز میں لسانی حکمت عملی کی طرف گاندھی جی کی توجہ دلائی گئی تھی لیکن جلسے میں سنی ان سنی کر دی گئی۔ خط کے کسی پہلو اور کسی نکتے کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔
بعد کو، ۹ مئی ۱۹۳۶ء کے "ہریجن" میں "ہندی یا ہندوستانی" کے نام سے گاندھی جی کا جو مضمون شائع ہوا ہے، اور جس کا آغاز اس طور پر ہوتا ہے:

"Elsewhere, the reader will find a deeply interesting letter from an esteemed friend which was read to the delegates who recently assembled in Nagpur and who inaugurated the Akhil Bharatya Sahity a Parished."[۳۴]

گاندھی جی نے اپنے مضمون کے بین السطور مجیب صاحب کا پورا خط نقل کر دیا ہے۔ اس کا ضمنی تذکرہ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ "اردو" اپریل ۱۹۳۶ء میں کیا ہے۔ اس طویل خط میں پروفیسر مجیب نے ہندی، ہندوستانی اور اردو کے اختلاف کی تاریخ کو دہراتے ہوئے اس میں پیچیدگیاں پیدا کر کے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی ساری ذمہ داری کانگریس کے علاوہ پرشوتم داس ٹنڈن، کنہیالال منشی، رسالہ "ھنس" کی زبان اور خود گاندھی جی کی غلط لسانی پالیسی پر ڈالی ہے۔

گاندھی جی نے مجیب صاحب کے خط کو "پریشد" کے جلسے میں نظرانداز کر دیا تھا بعد کو غور و فکر کے بعد دو قسطوں میں اس کا جواب لکھا، اور ہندی، ہندوستانی کے سلسلے میں ایسی تاویلات بے جا سے کام لیا کہ مسلم لیگ یا انجمن ترقی اردو ہی کو نہیں برصغیر کے سارے مسلمانوں اور انصاف پسند ہندوؤں کو بھی بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ دو قوموں کے درمیان نفرت و بد دلی کی جیسی وسیع اور گہری خلیج ان تاویلات سے پیدا ہو گئی، اس سے پہلے نہ تھی بھارتیہ ساھتیہ پریشد میں گاندھی جی کی تقریر کے بعد ہندی، ہندوؤں کی اور اردو، مسلمانوں کی زبان قرار پائی اور اس نے دو قومی نظریئے کو تقویت پہنچائی جس کی حمایت مسلمان پچھلی صدی سے کر رہے تھے اور جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے پہلے کی طرح اب بھی جاری تھی۔ سید ہاشمی فریدآبادی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

> "بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے اجلاس اور گاندھی جی کے پے در پے بیانات کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ گاندھی جی کے طرز عمل پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور اختلافات کی فہرست میں زبان کا قضیہ جلی عنوان بن گیا۔"[۳۵]

"بھارتیہ ساھتیہ پریشد" کے قیام اور اس کے بعد کانگریس اور مہاسبھا کے رہنماؤں اور عام ہندوؤں نے قومی زبان کے مسئلے پر اپنے رویے میں جو تبدیلی کی اور جو موقف اختیار کیا وہ بظاہر نیا اور اچانک معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ جیسا کہ پچھلے ابواب میں جگہ جگہ ذکر آیا ہے ہندوؤں نے درپردہ یہ موقف روز اول سے اختیار کر رکھا تھا۔ کانگریس صرف اس غرض سے کہ مسلمان کسی طرح دو قومی نظریے، جداگانہ انتخاب اور

تقسیم ہند کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں، ابتدآ زبان کے سلسلے میں "ہندی۔ کا نام
تدرے تکلف سے لیتی تھی، خاص طور پر گاندھی جی اپنی میٹھی باتوں سے بہت سے
مسلمانوں کا دل لبھا لیتے تھے۔ لیکن ان کی نیت شروع ہی سے خراب تھی۔ بابو راجندر پرشاد
نے اپنی آپ بیتی میں بہ عنوان "ہندی اور کار خدمت۔ اور قومی زبان کا سوال۔ میں جو کچھ لکھا
ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندو مہا سبھا، ہندی پرچارنی سبھا اور ہندی ساہتیہ سمیلن کے
انتہا پسند کارکنان بیسویں صدی کے اوائل ہی سے ہندی اور ناگری کو آگے بڑھا کر اردو کو ختم
کرنے کے لئے جو کچھ کر رہے تھے، اس میں کانگریس کے نامور لیڈر مثلاً راجندر پرشاد،
مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ شریک تھے۔ لیکن بعض مصلحتوں کی بنا پر یہ کام
بہت دنوں تک ڈھکا چھپا کر کیا گیا۔ لیکن جب بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخر اور
چوتھی دہائی کے شروع میں مسلمان اپنے باہمی اختلاف کے سبب سیاسی طور پر کمزور ہو
گئے اور ۱۹۳۵ء کے انتخاب میں ہندوؤں کا مستقبل واضح طور پر روشن نظر آنے لگا، تو
انہوں نے حکومت اور اکثریتی قوت کے زعم میں آکر بالا علان یہ کہہ دیا کہ ہندوستان کی قومی
زبان اردو یا ہندوستانی نہیں، ہندی ہندوستانی یعنی ہندی ہوگی۔

مولانا نیاز فتح پوری نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد اور اس کے بعد کے واقعات کا تجزیہ
کرتے ہوئے جولائی ۱۹۳۶ء کے نگار میں آٹھ صفحے کا ایک پر زور اداریہ لکھا تھا اس میں
مہاتما گاندھی اور کانگریس کے رہنماؤں کی لسانی و سیاسی سازش اور مسلمانوں کی غفلت و
بے نیازی کا بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، صرف ایک اقتباس دیکھئے:

"جب ہندی اردو کی نزاع شروع ہوئی اسی وقت سے باہمی مفاہمت کا
خیال بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا لیکن اس سلسلہ میں ہندو،
مسلمان دونوں کے طریق کار میں زمین و آسمان کا فرق رہا ہے غالباً یہ کہنا
حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ ہندوؤں نے کبھی اپنے حقیقی مقصود کو ظاہر
ہونے ہی نہیں دیا اور مسلمان نے جو تدبیریں اختیار کیں وہ سب جہل ولا
علمی کی حالت میں حریف کی چال کو سمجھے بغیر اختیار کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ ہندو منزل سے قریب تر ہوتے گئے اور مسلمان بجائے آگے بڑھنے
کے اور پیچھے ہٹنے لگے۔۔"

ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ اول اول جس وقت اردو کے ساتھ ہندی رسم الخط کا
رواج شروع ہوا تو کم از کم صوبہ متحدہ، پنجاب، بہار اور وسط ہند کے بالائی حصہ میں ہر پڑھا

لکھا ہندو اردو زبان بولتا تھا اور اردو رسم الخط میں مراسلت کرتا تھا لیکن جونہی قومی تحریکات اور مذہبی عصبیت کے سلسلہ میں ہندی رسم خط کا سوال پیدا ہوا تو ہر چہار طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اردو زبان میں چونکہ فارسی، عربی کے ایسے ثقیل الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں جن کا سمجھنا ہندوؤں کے لئے دشوار ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہندی کو رائج کیا جائے جو اس ملک کے باشندوں کی صحیح زبان ہے۔

مسلمانوں کی قوم جس نے سیاسی چالوں کے سمجھنے میں کبھی اپنی دانائی وفراست کا ثبوت پیش نہیں کیا، ہندوؤں کے اس بیان پر ایمان لے آئی اور صرف اس خیال سے کہ اردو سے ہندوؤں کا تعلق باقی رہے، اس نے مصالحت و مفاہمت کی یہ صورت پیدا کرنا چاہی کہ اردو زبان سے عربی، فارسی کے الفاظ نکال کر اس کو زیادہ آسان بنایا جائے۔ گویا اس کے نزدیک اصل نزاع صرف زبان سے متعلق تھی نہ کہ رسم الخط سے اور ہندو چاہتے بھی یہی تھے کہ مسلمان ان کے حقیقی مقصود سے بے خبر رہ کر اپنی تمام تر توت ایک ضمنی مسئلہ پر صرف کرتے رہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اردو کو عربی، فارسی الفاظ سے پاک کر کے زیادہ آسان و سہل الفہم بنانا چاہئے اور آج بھی جبکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ ہندوؤں کا حقیقی مدعا کیا ہے، یہ کوشش برابر جاری ہے۔ پھر اگر ہندوؤں کا مقصود واقعی یہی ہوتا کہ وہ اردو زبان کو سہل و آسان دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں اس تحریک کا خیر مقدم کر کے کوئی عملی حصہ اس میں لینا چاہئے تھا۔ لیکن انہوں نے مطلق کوئی التفات اس طرف نہیں کیا اور آہستہ آہستہ انہوں نے اردو رسم الخط کو ترک کر کے اس کی زبان وانشا کو بھی بدلنا شروع کیا اور ٹھیک اس وقت جبکہ مسلمان اردو سے عربی، فارسی کے الفاظ نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے ہندوؤں نے سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے شروع کر دئے۔ یہاں تک کہ وہی ہندو جو زبان کی سادگی کا دلدادہ تھا "لیکن۔ اور" مگر۔ ایسے ہلکے اور کثیر الاستعمال الفاظ بھی بھول گیا اور ان کی جگہ اس کو "پرنتو۔ زیادہ سلیس و عام فہم نظر آنے لگا۔ ہندی کے میگزین جاری ہوئے، کتابیں تصنیف ہونے لگیں، سمیلنیں (انجمنیں) قائم ہوئیں۔ سبھائیں رچائی گئیں، یہاں تک کہ ہندی کالجوں کی بنیاد پڑی، جن میں سے ہر ایک کا مقصد ہندوستان کی قدیم مذہبی سنسکرت کو رائج کرنا ہے۔ لیکن مسلمان اور احمق مسلمان ہنوز، یہ آس لگائے ہوئے ہیں کہ ممکن ہے وہ اردو سے عربی و فارسی کے الفاظ نکال کر ہندوؤں کو پھر اردو کی طرف مائل کر سکیں۔

میں اس سے قبل بھی بارہا اس باب میں اظہار خیال کر چکا ہوں اور اب پھر اُس کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہندوؤں کو مخالفت اردو زبان سے نہیں بلکہ اردو رسم خط سے ہے، چنانچہ اس کا سب سے بڑا ثبوت گاندھی جی کا وہ فقرہ ہے جو ناگپور کی بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے جلسہ میں ان کی زبان سے بے اختیارانہ نکل گیا یعنی یہ کہ:

"اردو زبان مسلمانوں کی مذھبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا، مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

یہ ہے وہ اصل ذہنیت جو ابتدا ہی سے ہندوؤں میں کام کر رہی تھی اور جس کا اعلان انہوں نے اس وقت تک صرف اس لئے نہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو قصداً دھوکے میں رکھنا چاہتے تھے اور اس کا اظہار کر کے وہ سیاسی مسائل میں پیچیدگی پیدا کرنا پسند نہ کرتے تھے، لیکن اب جبکہ ان دونوں کی سیاسی راہیں بالکل علیحدہ قائم ہو چکی ہیں اور ان کے باہم مل کر کام کرنے کا سوال باقی نہیں رہا، کوئی وجہ نہ تھی کہ گاندھی جی کے دل کا کانٹا زبان پر نہ آتا۔ میں اسے کانٹا اس لئے کہتا ہوں کہ گاندھی جی ایسی شخصیت کے لئے اس سے زیادہ سخت لفظ استعمال کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا، ورنہ ذہنیت کی اس پستی و ذلت کا اظہار اور وہ بھی ایک ایسی ذمہ دار ہستی کی طرف سے، ہر ممکن لعنت و ملامت کا مستحق ہے۔ بہر حال اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اصل نزاع زبان کی نہیں ہے، رسم خط کی ہے یعنی ہندوؤں کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ زبان کو عام فہم بنایا جائے کیونکہ وہ خود اس کے لئے تیار نہیں ہیں اور اس کے بالکل برعکس اسے اور زیادہ مشکل بناتے جا رہے ہیں بلکہ اصل مدعا یہ ہے کہ وہ رسم خط ان کی نگاہ کے سامنے نہ آئے جس میں قرآن لکھا جاتا ہے اور جو کسی وقت مسلم بادشاہوں نے رائج کیا تھا۔ پھر اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے اردو سے عربی، فارسی کے الفاظ بالکل نکال بھی دئے (جس کا کوئی امکان نہیں ہے) تو کیا وہ ہندوؤں کو اپنی طرف مائل کر سکیں گے اور کیا ان کی یہ ذہنیت بدلی جا سکتی ہے کہ قرآنی حروف کا مطالعہ ان کے دھرم کو بھرشٹ کر دینے والا ہے؟

یقیناً اب راستہ بالکل صاف ہو گیا ہے اور ہم کو پھر از سر نو، اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ اردو زبان کی بقا و اصلاح کے لئے ہم کو کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔[۳۷]

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندو اور ان کی قومی جماعتوں کی کوشش سے ہندی اور ناگری کے مطالبے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا تھا، بھارتیہ ساھتیہ پریشد کی

کارروائیوں سے صاف کھل گیا تھا کہ ہندی کے سوا کسی اور زبان کو قومی زبان بنانے کے لئے ہندو تیار نہ ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں، حکومت کی واضح طرفداری کے سبب لسانی مسائل میں انہیں خاصی کامیابی ہوئی تھی۔ موجودہ پاکستان، یعنی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو چھوڑ کر بیشتر صوبوں اور ریاستوں میں اردو کی کرسی، ہندی کو دے دی گئی تھی یا دلوانے کی کوشش کی جارہی تھی، راجپوتانہ کی ریاستوں کے حکمران اگرچہ زیادہ تر ہندو تھے لیکن عام و خاص کی سہولت کی خاطر درباری و سرکاری کام اردو زبان میں ہوتا تھا۔ ہندوؤں کی قومی جماعتوں نے بیسویں صدی کی پہلی تین دھائیوں میں ان ریاستوں پر جائز و ناجائز زور ڈالنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان ریاستوں میں بھی اردو کی جگہ ہندی براجمان ہوگئی۔ جے پور، بھرت پور، دھولپور، بیکانیر، جودھپور اور اودے پور، سب میں ہندو مہاسبھا اور کانگریس کے دباؤ سے ناگری اور ہندی کا رواج ہوگیا۔[۱۳] ان باتوں نے ہندی کے حامیوں کا دل بڑھا دیا۔ ان کی سیاسی قوت اور قومی یکجہتی بھی بڑھ گئی تھی، اس لئے ان کی نظر میں مسلمان اور ان کے مطالبات زیادہ قابل توجہ نہ تھے۔

اردو کے بہی خواہ بھی اس کی مدافعت سے غافل نہ تھے، اپنے وسائل کے مطابق جو کچھ کر سکتے تھے کر رہے تھے، میکڈانلڈ نے یوپی میں ہندی اور ناگری کو رواج دے کر، اپنی سمجھ میں اردو اور اردو کے ہمدردوں کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن اردو کی سخت جانی اور اس کے بہی خواہوں کی حوصلہ مندی کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔ مسلمانوں نے اب دوسروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے ہی طور پر کچھ کرنے کی ہمت کرلی تھی۔ ابتداً چند آدمی اس کام کے لئے آگے بڑھے تھے پھر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ پوری ملت اسلامیہ اس کام میں شریک ہوگئی، مسلم لیگ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، خلافت کمیٹی، جمعیت العلمائے اسلام اور انجمن ترقی اردو سبھی نے اردو کو برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی رگ سمجھ کر اس کو بچانے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ نے سیاسی سطح پر اردو کا دفاع کیا اور اپنے مطالبات میں اردو کی حفاظت کو بھی شروع ہی سے پیش نظر رکھا۔ لارڈ میکڈانلڈ کے جانشین سر جیمز لاٹوش کے زمانے میں یہ جھگڑا وقتی طور پر ختم ہوگیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں پھر اس فتنے نے سر اٹھایا اس موقع پر مسلم لیگ آگے بڑھی اور اس نے اردو زبان کی تائید میں قرار دادیں منظور کیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا تیسرا اجلاس جنوری ۱۹۱۰ء میں زیر صدارت پرنس آف ارکاٹ، دہلی میں ہوا اور اس میں اردو کے مسئلے پر خاص توجہ دی گئی۔ صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا:

"اتحاد ملی کے لئے اردو کی اشاعت بھی بہت ضروری ہے کیونکہ اردو ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قومی یکجہتی میں زبان نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے اور اردو اس کے لئے موزوں ترین ہے۔ اردو میں مشرقی زبانوں کے سارے اوصاف جمع ہیں اور اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ پوری ملت اس کی ترقی کی طرف توجہ کرے۔ یہ بات بہر حال خوش آئند ہے کہ اردو کا حلقہ اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے حتی کہ مدراس کے لوگوں میں جہاں تامل، تلگو، ملیالم اور کنٹری وغیرہ مادری زبانوں کی حیثیت سے بولی جاتی ہیں، وہاں بھی اردو کو مقبولیت حاصل ہے۔ اس رجحان کو فروغ دینے اور اردو کو پورے برصغیر کی قومی زبان بنانے کی سخت ضرورت ہے" [۳۵]

اس جلسے میں اردو کے سلسلے میں مندرجہ ذیل قرارداد پاس ہوئی:

"آل انڈیا مسلم لیگ ان کوششوں کو جو بعض حلقوں کی طرف سے ہندوستان کی خاص الخاص زبان اردو کو نقصان پہنچانے کی غرض سے کی جا رہی ہیں غم و غصے کی نظر سے دیکھتی ہے اور اردو زبان کی بقا و ترقی کو ملک کے عام مفاد و ترقی کے لئے ضروری خیال کرتی ہے" [۳۶]

مخزن کے مدیر اور اردو کے مشہور ادیب سر شیخ عبدالقادر نے مندرجہ بالا قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا:

"قومی معاملات و مقاصد کی تشکیل و تعمیر میں جتنا اہم کردار تنہا اردو نے ادا کیا ہے کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ یہ واحد زبان ہے جو ہندوستان کے سارے طبقوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسری مقبول عام زبان کی تلاش ایسا ہی ہے جیسے سامنے گنگا بہہ رہی ہو اور کوئی شخص کنواں کھودنا شروع کر دے۔ اردو کی ضرورت تاجروں اور سیاحوں میں بڑے پیمانے پر محسوس کی گئی ہے، عملی ضرورتوں کے لئے اس سے بہتر کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔ اردو بیرونی اور ملکی زبانوں پر برابر اثر ڈال رہی ہے۔ ہندی سے بہت سے الفاظ اردو میں لئے جا رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ صرف اردو ایسی زبان ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں میں یکساں مقبول ہے۔ اس کو نقصان پہنچانا ہندوستان کے مفادات کا خون ا

کرنا ہے[۱۴۱]

شیخ عبدالقادر کی تقریر کے بعد قاضی کبیر الدین نے قرار داد کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"اردو کی تعلیم کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اور تمام ایسی کوششوں کا جو اردو کے مفاد کے خلاف کی جا رہی ہیں، مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ بات حب الوطنی اور جذبہ، ملی، دونوں کے لحاظ سے ضروری ہے اور مشترک وسیلہ اظہار کے لئے وقتاً فوقتاً جلسے کئے جائیں اور اس کی حفاظت کے لئے انجمنیں قائم کی جائیں[۱۴۲]"

"پیسہ" اخبار کے اڈیٹر مولوی محبوب عالم نے بھی قرار داد کی تائید کی انہوں نے اپنی تائیدی تقریر میں کہا:

"اردو ہندوستان کی لینگوا فرینکا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے اردو کا سخت سے سخت مخالف بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ مسلمانوں کے لئے ملی ترقی اور اردو کا تحفظ دونوں ہم معنی ہیں[۱۴۳]"

۱۹۱۰ء ہی کے آخری مہینے دسمبر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا چوتھا سالانہ اجلاس بمقام ناگپور ہوا۔ اس جلسے کی صدارت سید نبی اللہ نے کی اور اپنے خطبے میں کہا:

"اس وقت ایک اور اہم مسئلہ جو مسلمانوں کی فوری توجہ کا مستحق ہے، وہ اردو ہندی اور پنجابی کا مسئلہ ہے۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ اردو ہندوستان کی لینگو افرینکا ہے اور قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ہرچند کہ ہر طرف سے رکاوٹیں پیدا کی جاری ہیں، پھر بھی وہ روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ مدراس، نیپال، آسام اور بنگال تک میں وہ روز مرہ کی زندگی میں اور اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ جو زبان اتنی مقبول اور اہم ہو، مسلمانوں کو اس کی حفاظت اور ترقی کے لئے ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے[۱۴۴]"

اس اجلاس کی تیسری نشست ۳۰ دسمبر کو سر آغا خاں کی صدارت میں ہوئی اس میں اردو کے متعلق مندرجہ ذیل قرار داد اتفاق رائے سے منظور کی گئی:

"آل انڈیا مسلم لیگ ان پے بہ پے کوششوں کو جو مختلف شکلوں میں، اس غرض سے کی جا رہی ہیں کہ صوبہ جات آگرہ و اودھ اور پنجاب میں،

ہندوستان کی لینگوا فرینکا اردو کو ہٹا کر ہندی اور پنجابی کو رواج دیا جائے، غم و غصہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس خیال سے کہ اردو زبان و ادب کا تحفظ ملک کے مفاد عامہ خصوصاً شمالی ہند کی ترقی کے لئے ضروری ہے آل انڈیا مسلم لیگ حکومت سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ان کوششوں کی حمایت نہ کرے جو اردو کو نقصان پہنچانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔[۴۵]

اسی زمانے میں یعنی ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء کے کامریڈ میں مولانا محمد علی جوہر نے اردو ہندی کے مسئلے پر ایک طویل مقالہ بھی انگریزی زبان میں لکھا۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ:

"اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر ہندو بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔ مسلمان کا ایثار یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبانوں، ترکی اور فارسی اور اپنی مذہبی زبان عربی کو چھوڑ کر ہندوؤں کی خاطر مقامی زبان اردو کو اپنا لیا۔ اردو برصغیر کی مشترک زبان ہے اور ہندوؤں کا اس کے خلاف احتجاج ملک کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتا، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف باتیں نہیں بلکہ اردو کی ترقی و ترویج کے لئے عملاً کچھ کیا جائے، اُس کی علمی و ادبی حیثیت اتنی مضبوط کر دی جائے کہ ناگری اور ہندی کا طوفان اٹھانے والے اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔"[۴۶]

مارچ ۱۹۱۲ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پانچواں سالانہ اجلاس کلکتے میں ہوا اور اس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ مسٹر گوکھلے نے ابتدائی تعلیم سے متعلق پارلیمنٹ میں جو بل پیش کیا ہے مسلم لیگ اصولی طور پر اس سے متفق ہے، بشرطیکہ اس سے مسلمانوں کے مفاد کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور یہ شرط اس لئے لگائی گئی تھی کہ ابتدائی تعلیمی بل کے قانون بن جانے کے بعد بقول محمد شفیع، اس بات کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اردو کے مقابلے میں ہندی کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے۔[۴۷]

اردو کے سلسلے میں ایک قرارداد ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے نویں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں بھی منظور کی گئی، یہ اجلاس قائد اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا تھا۔ قرارداد کے مجوز واحد حسین اور موید آل نبی و ظہور احمد تھے۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ:

"آج کل مختلف حلقوں کی طرف سے جو کوششیں اردو کے خلاف، اس کو ہندوستان کی لینگوا فرینکا کے جائز مقام سے محروم کرنے کے لئے کی

جاری ہیں۔ مسلم لیگ ان کو تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان تمام لوگوں پر جو کہ ہندوستانی قومیت کی تشکیل سے دلچسپی رکھتے ہیں، زور دیتی ہے کہ وہ اردو کی حمایت کریں کیونکہ صرف یہی زبان ایسی ہے جو ملک کی مشترک زبان ہو سکتی ہے۔[۴۸]

دسمبر ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا دسواں سالانہ اجلاس کلکتے میں ہوا اس میں متعدد قرار دادیں منظور کی گئیں، پندرہویں قرار داد، حسب ذیل تھی:

"آل انڈیا مسلم لیگ، ملت اسلامیہ کی اس شدید خواہش کے پیش نظر کہ اس کے مفادات کو قانونی تحفظ دیا جائے، حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ جو آئینی اصلاحات آنے والی ہیں ان میں ان باتوں کو ضروری شامل کیا جائے

۱۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔

۲۔ مسلمانوں کو صوبائی لیجسلیٹو کونسل میں جو نمائندگی حاصل ہے وہی انہیں سرکاری یونیورسٹیوں میں ملنی چاہیے۔

۳۔ اردو اور اس کے رسم الخط کو ان صوبوں کی عدالتوں اور سرکاری دفتروں جہاں وہ رائج ہیں، برقرار رہنا چاہیے اور ان صوبوں کے ابتدائی مدارس میں اسے ذریعہ تعلیم بھی ہونا چاہیے۔

۴۔ مسلمانوں کو ان باتوں کی سہولت، تحفظ اور اعانت حاصل ہونی چاہیے کہ وہ مذہبی تقریبات اور بقر عید و محرم کے موقعوں کی رسوم، بغیر کسی مداخلت کے ادا کر سکیں۔[۴۹]

بعد ازاں مارچ ۱۹۲۹ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کی طلب کردہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہوا، اس میں وہ چودہ نکات ایک قرار داد کی صورت میں منظور ہوئے جو "قائد اعظم کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہیں اور جن مطالبات کی بنیاد پر تحریک پاکستان کی جنگ آخری منزلوں تک لڑی گئی۔ ان چودہ نکات میں جہاں اور باتیں شامل تھیں۔ وہاں مندرجہ ذیل دو شقیں بھی شامل تھیں:

۱۔ تمام طبقوں کو اپنی عبادات، عقائد، اجتماعات، تقریبات، انجمن سازی اور تعلیم و تبلیغ کے تحفظ کا حق حاصل ہو۔

۲۔ آئین میں مسلمانوں کی ثقافت، زبان، مذہب، تعلیم، قوانین اور فلاحی

اداروں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔[۵۰]

مسلمانوں کے نقطہ نظر سے یہ دو آخری شقیں، بہت اہم تھیں کہ انہیں پر دو تہذیبوں اور دو قومیتوں کے دعوے کا دار مدار تھا اور ان کے تحفظ کی ضمانت اردو کو قومی زبان تسلیم کئے بغیر ممکن نہ تھی۔ چنانچہ جب آگے چل کر ان دفعات کی توضیح و تصریح کی منزل آئی تو مسلمانوں نے واضح الفاظ میں یہ مطالبہ کر دیا کہ اردو کو اپنی مروجہ شکل و صورت کے ساتھ خواہ اس کا نام ہندوستانی ہی کیوں نہ ہو برصغیر کی مشترکہ اور قومی زبان تسلیم کیا جائے۔

یہ ان مطالبات کا مختصر ذکر تھا جو مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی طرف سے اردو کے سلسلے میں ۱۹۰۶ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان کئے گئے لیکن مسلم لیگ ہی پر موقوف نہیں، مسلمانوں کے دوسرے اداروں اور جماعتوں کی طرف سے بھی اردو کے حق میں خصوصاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے بھی اس سلسلے میں جو کام ہوا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بنیادی تعلق اگرچہ مسلمانوں کی تعلیم سے تھا لیکن اس نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور مطالبوں کو ہمیشہ اردو سے وابستہ رکھا۔ جگہ جگہ اردو اسکول کھلوانے، نصاب میں اردو کو لازمی اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے داخل کرانے اور مختلف سطحوں پر اسے ذریعہ تدریس بنانے کی کوششیں کیں، چونکہ اس کے حلقہ اثر میں پورا برصغیر شامل تھا اور اس کے سالانہ جلسے، مختلف صوبوں میں ہوا کرتے تھے نیز اس کے جلسوں کی ساری کارروائی اردو میں ہوتی تھی اور تقاریر و مقالات بھی اردو ہی میں پڑھے جاتے تھے، اس لئے اردو کی آواز کو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچانے میں اس نے اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے اجلاسوں میں اردو کی حمایت اور اس کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں متعدد قرار دادیں منظور ہوئیں اور شرکا کی تقریروں میں ہندی اردو کے مسئلے پر اظہار خیال کیا گیا۔ ساتھ ہی مسلم اداروں اور جماعتوں کے ان سارے اقدامات کو سراہا گیا اور حمایت و امداد کی طرف سارے مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی گئی جن کا تعلق اردو یا عربی و فارسی سے تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء کے ساتویں سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی[۵۱] میں ایک قرار داد اس امر سے متعلق منظور کی گئی کہ:

"انجمن حمایت اسلام لاہور نے مبتدیوں کے لئے جو درسی رسالے تالیف کئے تھے کانفرنس نے ان کو پسند کیا اور ان کی اشاعت کی سفارش کی۔"

۱۸۹۵ء کے دسویں سالانہ اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ:

"ندوۃ العلما نے جو عربی دارالعلوم بنانے کی تجویز کی ہے اس کانفرنس کے نزدیک اس قسم کے دارالعلوم سے عربی علوم کی ترقی کی امید ہے۔ لہٰذا یہ کانفرنس بھی ایسے دارالعلوم کی ضرورت کو تسلیم کرتی ہے اور اس معاملے میں ندوۃ العلما کے ساتھ متفق الرائے ہے۔"[۵۲]

تیرہواں اجلاس ۱۸۹۹ء میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل قرار دادیں پاس ہوئیں:

۱۔ پرائیویٹ اور سرکاری مدارس میں مسلم بورڈنگ ہاؤس قائم کئے جائیں۔

۲۔ ممالک شمالی مغربی کی عدالتوں اور دفتروں میں اردو کو فارسی رسم الخط میں جاری رہنا چاہئے۔

۳۔ بی۔ اے کی ڈگری کے لئے فارسی کا بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا ضروری ہے۔

۴۔ مسلمانوں کو میڈیکل مدارس میں داخلے کی ترغیب دی جائے۔[۵۳]

۱۹۰۲ء کے اجلاس منعقدہ دہلی میں اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ "کانفرنس کے دائرہ عمل کو سندھ تک وسیع کر دیا جائے تاکہ سندھ کے مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل ہو سکے اور وہاں کی تعلیم ترقی و اصلاح کی کوشش کی جائے، دوسرے یہ کہ قومی یونیورسٹی کے لئے صوبہ وار کمیٹیاں قائم کی جائیں۔"[۵۴]

اٹھارواں اجلاس ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی زبان کی تعلیم و تدریس بدستور جاری رہنی چاہئے۔[۵۵]

۱۹۰۷ء میں مولانا الطاف حسین حالی کی صدارت میں بمقام کراچی، کانفرنس کا اکیسواں اجلاس ہوا۔ اس میں طے پایا کہ سندھ کے سرکاری مدارس میں فارسی زبان کی تعلیم کے لئے مسلمان مدرس اور سندھ کے محکمہ تعلیم میں مسلمان افسر مقرر کئے جائیں۔[۵۶]

اسی طرح کی تجویزیں ۱۹۱۰ میں ناگپور[۵۷] کے اجلاس میں ممالک متوسط کے لئے اور ۱۹۱۳ء کے اجلاس منعقدہ آگرہ میں[۵۸] ریاست کے کالجوں اور اسکولوں کے متعلق پاس کی گئیں، آگرے کے اجلاس میں یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ صوبہ پنجاب میں ایجوکیشنل کانفرنس کی صوبائی شاخ قائم کی جائے۔ کانفرنس کا اکتیسواں اجلاس ۱۹۱۷ء میں کلکتے میں ہوا۔

اس جلسے میں ذیل کی دو قراردادیں منظور کی گئیں:

۱۔ پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے امتحانات کے لئے جو سہولتیں ہیں، کلکتہ یونیورسٹی بھی وہی سہولتیں مہیا کرے۔

۲۔ صوبہ بمبئی اور بنگال میں ان طلبہ کے لئے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، اردو کو سیکنڈ لینگویج کی فہرست میں شامل کرے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں کانفرنس کا سینتیسواں سالانہ اجلاس بمبئی میں ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا اور طے پایا کہ صوبہ بمبئی کے گورنمنٹ کالجوں میں اردو پروفیسروں کا تقرر کیا جائے[۵۹]۔ سنہ ۱۹۲۵ء کے اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں صدر جلسہ صاحب زادہ سر عبدالقیوم رئیس پشاور نے کہا:

"اردو ہی وہ زبان ہے جس میں ہندوستان کی قومی زبان بن جانے کے آثار صدیوں سے نشو و نما پا رہے ہیں اور یہ اس قابل نظر آتی ہے کہ اس کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے[۶۰]"

سنہ ۱۹۲۶ء میں کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں، مدراس ہائی کورٹ کے جج سر عبدالرحیم کی صدارت میں ہوا۔

اس اجلاس میں دو خاص ریزولیوشن پاس ہوئے، ایک یہ کہ جن صوبوں میں مسلمان اردو نہیں بولتے وہاں کے نصاب میں بھی اردو رسم الخط جاری کیا جائے، دوسرے یہ کہ مشرقی علوم کی فیکلٹیاں یونیورسٹیوں میں کھولی جائیں[۶۱]۔

چالیسویں اجلاس منعقدہ مدراس سنہ ۱۹۲۷ء میں زیر صدارت سر عبدالقادر یہ ریزولیوشن پاس ہوا کہ:

"اردو زبان کو تجربتاً ذریعہ تعلیم بنانا مستحسن طریقہ عمل ہے۔"

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اکتالیسواں سالانہ اجلاس بمقام اجمیر، زیر صدارت سر شاہ محمد سلیمان، جج الہ آباد ہائی کورٹ، ۱۹۲۸ء میں منعقد ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس ہوئے:

۱۔ اردو کی چھپائی میں لیتھو کے بجائے ٹائپ کا انتظام ہونا چاہئے۔[۶۳]

۲۔ اردو زبان کے تحفظ کے لئے ایک عظیم الشان مرکزی کتب خانہ قائم کیا جائے۔

۱۹۳۴ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ میرٹھ، زیر صدارت سر عبدالقادر مندرجہ ذیل تجویزیں منظور کی گئیں:

۱۔ یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ صوبہ متحدہ ورنیکولر مڈل مدارس میں فارسی، عربی اور سنسکرت کو بطور اختیاری مضمون رائج کر کے ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور طلبہ کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینے کا اختیار دیا جائے۔

۲۔ یہ کانفرنس آگرہ، الہ آباد، لکھنؤ اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کی اس کارروائی کو کہ اب تک ان میں کوئی مسلمان وائس چانسلر مقرر نہیں ہوا، نہایت افسوس کے ساتھ دیکھتی ہے اور ان کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ اس معاملے میں فراخ دلی سے کام لیں[۶۴]۔

اڑتالیسواں سالانہ اجلاس بمقام علی گڑھ منعقد ہوا جس کی صدارت مدراس کے رئیس نواب عبدالحلیم نے کی۔ اس میں صاحب صدر نے اردو کے بارے میں کہا:

"اگرچہ ہندوستان کے سب صوبوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن وہ ہندوستان کے ہر صوبے میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اس لئے تھوڑی سی کوشش سے وہ ہندوستان کی عام زبان ہو سکتی ہے جن صوبوں کے بھائیوں کی مادری زبان اردو ہے انہیں دوسرے صوبوں مثلاً مدراس یا بنگال کے بھائیوں کی اردو پر ہنسنا نہیں چاہئے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے کہ باوجود کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن وہ دوسرے صوبوں کے بھائیوں کی خاطر، اس کے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مجھے اپنے عزیز تعلیم یافتہ نوجوانوں سے شکایت ہے کہ وہ اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے کافی کوشش نہیں کرتے اور ان میں بہت کم ایسے ہیں جو اردو کی خدمت میں مصروف ہوں۔ البتہ پنجاب کے نوجوان نسبتاً اردو کی زیادہ خدمت کر رہے ہیں جس سے مجھے مسرت ہوتی ہے[۶۵]۔

کلکتہ کے پچاسویں اجلاس میں زیر صدارت کمال یار جنگ یہ قرار داد منظور ہوئی کہ یہ اجلاس حکومت ہند اور حکومت سرحد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ صوبہ سرحد میں علیحدہ یونیورسٹی قائم کرے[۶۶]۔ کانفرنس کا باونواں اجلاس ظہیر یار جنگ بہادر کی صدارت میں بمقام علی گڑھ ہوا اور یہ تجویز منظور کی گئی کہ "دہلی یونیورسٹی میں جملہ مضامین اردو زبان میں پڑھائے جائیں اور اردو زبان کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے[۶۷]۔

اردو کے سلسلے میں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کی مذکورہ بالا

کوششوں میں "انجمن ترقی اردو" بھی برابر کی شریک رہی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی اردو خدمات، ان دونوں سے بہت آگے بڑھ گئیں۔ ایک طرف انجمن نے یہ کیا کہ برصغیر میں اردو ہندی کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے مسلم لیگ، مسلم کانفرنس اور دوسرے اردو دوست افراد اور اردو کے ہمدرد اداروں کو باخبر رکھا، دوسری طرف اس نے اس خیال سے کہ اگر کسی وقت اردو کو سرکاری اور قومی زبان بنانے کا موقع آئے تو وہ اس کے لئے ہر طرح موزوں اور اہل ثابت ہو۔ اردو کے علمی و ادبی ذخیرے کو گراں مایہ اور اردو نثر کو سنجیدہ مضامین کا متحمل بنانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس وقت اور جان پیدا ہو گئی جبکہ ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق، انجمن کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۳۵ء تک اورنگ آباد میں رہ کر، مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی معرفت اردو کے لئے جو کچھ کیا وہ زبان کی تاریخ میں بہت ہی قیمتی حصہ ہے۔

جیسا کہ سید غلام ربانی نے تفصیل سے لکھا ہے، مولوی عبدالحق کے انجمن سے منسلک ہو جانے کے بعد اس کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی، ارکان اعانت کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ دو تین سال کے اندر کچھ کتابیں بھی شائع ہو گئیں، ملک کے مشہور اخبارات میں انجمن کی حمایت میں پرزور مضامین نکلنے شروع ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں انجمن ترقی اردو کا ایک عام جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا جس میں ملک بھر کے علما، فضلا، اکابر قوم، شعرا، ادبا اور مشائخ درؤسا شریک ہوئے۔ ۱۹۱۷ء تک شیدایان اردو کی ارکان دوامی کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں انجمن کے سفیر کی حیثیت سے مختلف صوبوں اور علاقوں میں بعض حضرات کو دورے پر بھیجا گیا اور جگہ جگہ انجمن کی شاخیں اور اردو کتب خانے قائم کئے گئے ان کوششوں کی بدولت ۱۹۱۹ء کے بعد انجمن کی مطبوعہ کتابوں کی مانگ بڑھ گئی، چنانچہ مطبوعات میں اضافہ کیا گیا اور بعض کتابیں اپنی مقبولیت کی بنا پر کئی بار چھاپی گئیں۔ ۱۹۲۴ء سے انجمن نے کتابوں کی ایجنسی کا کام بھی شروع کر دیا، اسی سال انجمن کا اپنا پریس قائم ہوا۔ "رسالہ اردو" ۱۹۲۱ء سے جاری تھا، ۱۹۲۸ء میں "سائنس" کے نام سے ایک اور رسالے کا اجرا کیا گیا۔[۶۸]

مولوی عبدالحق کی ذاتی کوششوں سے یہ بھی ہوا کہ مسلم لیگ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی طرح انجمن ترقی اردو کے اجلاس بھی اردو کانفرنس کے نام سے جا بجا ہونے لگے۔ ہر صوبے، ہر ضلع، ہر ریاست اور بڑے قصبے میں انجمن کی شاخیں قائم کی گئیں۔ جہاں جہاں اردو کا رواج کم تھا اور ہندی کے غلبہ پا جانے کا خطرہ تھا وہاں

وہاں خاص طور پر انجمن کی طرف سے اردو کی حمایت و اشاعت کے لئے جلسے کئے گئے اور مختلف علاقوں کے کام کرنے والوں کے درمیان اتحاد و اشتراک کی فضا پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ان کوششوں کی بدولت چند برسوں میں برصغیر کے امیر، غریب اور متوسط گھرانوں کے سارے مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور قومی یکجہتی کا ایسا جذبہ رونما ہوا کہ کسی اور ذریعہ سے اب تک دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ پوری مسلمان قوم اردو کے مسئلے پر ہم خیال و ہم رائے ہو گئی اور ہندوؤں نے پورے برصغیر میں اردو کی جگہ ہندی کو قومی زبان بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ گاندھی جی نے ہندی کو کبھی "ہندوستانی"، کبھی "ہندی ہندوستانی" کہہ کر بہت فریب دینا چاہا لیکن انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق کو کوششوں نے اس فریب کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ ۱۹۳۶ء میں بمقام ناگپور، بھارتیہ ساھتیہ پریشد کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں مولوی عبدالحق نے پوری طرح بھانپ لیا تھا کہ ہندو اور کانگریس کے نیتا ہر حال میں ہندی کو قومی زبان بنانا چاہتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اسی وقت سے اس خطرے کے متعلق وضاحت سے لکھنا شروع کیا اور اردو کے بہی خواہوں کو پورے حالات سے باخبر رکھنے کے لئے بہ عجلت یعنی ۱۹۳۶ء ہی میں بمقام علیگڑھ خاص خاص لوگوں کا ایک جلسہ کرنے کا ارادہ کیا اس جلسے میں مختلف صوبوں اور علاقے کے لوگوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ دعوت نامے میں مولوی صاحب نے لکھا:

> "جس تجویز کا میں نے اپنے مضمون "بھارتیہ ساھتیہ پریشد کی اصل حقیقت" میں وعدہ کیا تھا، وہ میں جناب کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ مجھے آپ جیسے باخبر اور صاحب بصیرت شخص کی خدمت میں اس امر کے جتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری زبان کے لئے یہ وقت بہت نازک ہے اور اگر اس وقت ہم نے اس کے تحفظ اور ترقی کے لئے کچھ نہ کیا تو ہم اپنے ملک اور قوم کے حق میں بڑا ظلم کریں گے۔ وقت کی نزاکت اور ملک کے حالات کو دیکھ کر بہت غور و فکر کے بعد یہ تجویز مرتب کی گئی ہے اور مصمم ارادہ کر لیا گیا ہے کہ خواہ ہمارے راستے میں کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں ہم اس پر عمل کر کے رہیں گے۔ اس غرض سے منتخب اصحاب کی ایک کانفرنس کا انعقاد علیگڑھ یونیورسٹی میں اکتوبر کی ۲۴ اور ۲۵ کو کیا جائے گا۔ اس کانفرنس میں جس میں ہر صوبے کے

نمائندوں کو مدعو کیا گیا ہے یہ تجویز غور و بحث کے لئے پیش کی جائے گی
لہٰذا مودبانہ التماس ہے کہ جناب اس کانفرنس میں شریک ہو کر اپنے
خیالات سے مستفید فرمائیں۔ یہ کانفرنس کوئی عام مجمع نہ ہوگا بلکہ صرف
ایسے منتخب اصحاب کو زحمت دی گئی ہے جو زبان کے معاملے میں
خاص بصیرت اور تجربہ رکھتے ہیں اور اپنے اپنے صوبے کے نمائندہ ہو
سکتے ہیں تاکہ اس تجویز کے ہر پہلو پر اطمینان کے ساتھ غور اور بحث ہو
سکے کانفرنس کی منظوری کے بعد عام طور پر اس کا اعلان کیا جائے گا اور
جو امور کانفرنس میں طے ہوں گے، ان پر جہاں تک جلد ممکن ہوگا، عمل
درآمد شروع کر دیا جائے گا۔

چونکہ یہ نہایت اہم اور ضروری مسئلہ ہے اور اس کا قطعی فیصلہ کرنا ہے
اس لئے آپ کی شرکت کی خاص طور پر استدعا کی جاتی ہے۔ ایسے اجتماع
بار بار نہیں ہو سکتے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر جہاں تک ہمارے
امکان میں ہے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔[۶۹]

۲۴ اور ۲۵ اکتوبر کو جلسہ ہوا اس میں مختلف صوبوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ ڈاکٹر ضیاالدین استقبالیہ کمیٹی کے صدر اور پروفیسر رشید احمد صدیقی سکریٹری تھے۔ پہلے دن اجلاس کی صدارت راجہ امیر احمد خان محمود آباد نے کی اور دوسرے دن کے اجلاس کے صدر نواب مہدی یار جنگ تھے۔ شرکا میں پنڈت امرناتھ ساحر، علامہ کیفی، منشی مہیش پرشاد اور رام بابو سکسینہ جیسے ممتاز غیر مسلم اردو ادیب بھی شامل تھے۔ مولوی عبدالحق نے جلسے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا اردو کی اشاعت و حفاظت کی طرف خصوصی توجہ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ سیاسی وجوہ کی بنا پر بہت جلد اس کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ چنانچہ طے پایا کہ انجمن کو زیادہ سے زیادہ فعال ادارہ بنایا جائے۔ اردو کے حقوق کی حفاظت زیادہ قوت کے ساتھ کی جائے اور علمی و ادبی مطبوعات کی رفتار کو تیز تر کر دیا جائے۔ ساتھ ہی مشاورتی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ارکان میں ڈاکٹر علامہ اقبال، عبدالستار صدیقی، مولانا ظفر علی خان، پنڈت کیفی، سر تیج بہادر سپرو، نواب صدر یار جنگ شیروانی، علامہ سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیروانی، پنڈت کشن پرشاد کول، مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق (مدراس)، رضا علی وحشت، قاضی عبدالودود، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر تاراچند کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس جلسے میں یہ

بھی طے کیا گیا کہ انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد سے دھلی منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں انجمن کا صدر دفتر، دکن کے بجائے برصغیر کے مرکز دھلی میں آگیا اور اب ان لسانی جھگڑوں سے نپٹنا انجمن کے لئے قدرے آسان ہو گیا جو کانگریس اور گاندھی جی کی ہٹ دھرمیوں کے سبب ہندی اردو کے سلسلے میں پیدا ہو گئے تھے۔

حواشی

۱۔ ابتدائی نام یہی تھا بعد میں "محمڈن" کا لفظ "مسلم" سے اور "کانگریس" کا لفظ "کانفرنس" سے بدل دیا گیا اور پورا نام "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" ہو گیا۔

۲۔ علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، سید الطاف علی بریلوی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، ۱۹۷۰ء۔ ص۔ ۲۰

۳۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ہاشمی فرید آبادی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص۔ ۱۳

۴۔ دی لوکل روٹس آف انڈین پالیٹکس (الہ آباد، ۱۸۸۰ء تا ۱۹۲۰ء)، آکسفورڈ، ۱۹۷۰ء، ص ۶۶

۵۔ دی لوکل روٹس آف انڈین پالیٹکس، ص۔ ۲۲۲

۶۔ ایشیا اینڈ ویسٹرن ڈامیننس، لندن، ۱۹۵۹ء، ص۔ ۲۰۰

۷۔ کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا، وی ڈی مہاجن، دہلی، ۱۹۶۲ء۔ ۷۲

۸۔ دی ڈسکوری آف انڈیا، ص۔ ۳۰۶ تا ۳۰۷

۹۔ ٹو نیشن تھیوری، ص۔ ۴۷۵

۱۰۔ برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، ص۔ ۳۵۰

۱۱۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص۔ ۶۳

۱۲۔ عظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، ص۔ ۶۳

۱۳۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص۔ ۸۶

۱۴۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص۔ ۱۴۳

۱۵۔ برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، ص۔ ۳۷۳ (حاشیہ)

۱۶۔ دی آل انڈیا مسلم کانفرنس (۱۹۲۸ تا ۱۹۳۵ء)، مرتبہ کے کے عزیز، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۷۲ء، ص

۱۷۔ برنین اینڈ مسلم انڈیا، لندن، بحوالہ حصول پاکستان، ص۔ ۱۸۰

۱۸۔ اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان دی انڈین انوائرنمنٹ، ص۔ ۳۶۱

۱۹۔ اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ، جلد سوم، حصہ دوم، ص۔ ۳۶۵

۲۰۔ "اردو ہندی ہندوستانی"۔ سجاد ظہیر، کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی، ۱۹۴۷ء، ص۔ ۳۴۔ ۳۵

۲۱۔ ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ نیشنل انٹگریشن، جی رام ناتھن، ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۴

۲۲۔ ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ نیشنل انٹگریشن، جی رام ناتھن، ۱۹۶۴ء، ص۔ ۱۲۴

۲۳۔ دی پرابلم آف ہندوستانی، ڈاکٹر تاراچند، الہ آباد، ۱۹۴۴ء، ص۔ ۱۵

۲۴۔ اردو ہندی ہندوستانی، ص۔ ۵

۲۵۔ اور لینگویج پرابلم، ص۔ ۱

۲۶۔ اور لینگویج پرابلم --- مہاتما گاندھی، مرتبہ آنندی ہنگورانی، کراچی، ۱۹۴۲ء، ص۔ ۱ تا ص۔ ۳

۲۷۔ دی پرابلم آف ہندوستانی، ص۔ ۱۶

۲۸۔ اور لینگویج پرابلم، ص۔ ۴

۲۹۔ خطبات عبدالحق، ص۔ ۵۱۔ ۵۲

۳۰۔ نگار (لکھنؤ)، بابت جولائی ۱۹۳۶ء، ص۔ ۱۰

۳۱۔ نگار (لکھنؤ) بابت جولائی ۱۹۳۶ء، ص۔ ۱۰۔ ۱۱

۳۲۔ نگار (لکھنؤ)، بابت جولائی ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق کا یہ مضمون شائع ہوا۔

۳۳۔ نگار (لکھنؤ)، جولائی ۱۹۳۶ء، ص۔ ۱۳

۳۴۔ اور لینگویج پرابلم، ص۔ ۶

۳۵۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۶۴

۳۶۔ "اپنی کہانی"۔ از راجندر پرشاد، مترجم گوپی ناتھ امن، ساھتیہ اکیڈمی، نئی دھلی، ۱۹۶۱ء، طبع اول، ص۔ ۱۶۱ تا ص۔ ۱۶۲ اور ص۔ ۵۷ تا ص۔ ۶۶۷

۳۷۔ نگار (لکھنؤ)، بابت جولائی ۱۹۳۶ء، ص۔ ۳ تا ص۔ ۶

۳۸۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "انگریزوں کی لسانی پالیسی"، ص۔ ۲۸۹ تا ص۔ ۳۰۸

۳۹۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۸۔ ۱

۴۰۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۱۳۲

۴۱۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۱۳۲

۴۲۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۱۳۳
۴۳۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۱۳۳
۴۴۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۱۳۳
۴۵۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۱۹۴
۴۶۔ سلکٹڈ رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف مولانا محمد علی جوہر، افضل اقبال، ص۔ ۲۹ تا ۵۰
۴۷۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۲۵۳
۴۸۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۳۸۴
۴۹۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص۔ ۴۳۹
۵۰۔ پاکستان موومنٹ ہسٹاریکل ڈاکومنٹس، جی الانہ، ص ۵۹
۵۱۔ مرقع کانفرنس۔ (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی قراردادوں اور تجویزوں کا مجموعہ) مرتبہ انوار احمد مارہروی، مطبع مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، ۱۹۳۵ء، ص۔ ۳۶ تا ۵۶
۵۲۔ مرقع کانفرنس، ص۔ ۵۶ تا ۵۹
۵۳۔ مرقع کانفرنس، ص ۱۷ تا ص۔ ۶۷
۵۴۔ مرقع کانفرنس، ص ۸۷ تا ص۔ ۹۱
۵۵۔ مرقع کانفرنس، ص ۹۹ تا ص۔ ۱۰۷
۵۶۔ مرقع کانفرنس، ص ۱۱۹ تا ص۔ ۱۲۸
۵۷۔ مرقع کانفرنس، ص ۱۴۳ تا ص۔ ۱۵۱
۵۸۔ مرقع کانفرنس، ص ۱۶۳ تا ص۔ ۱۶۸
۵۹۔ مرقع کانفرنس، ص ۲۲۵ تا ۲۲۹
۶۰۔ خطبات عالیہ، حصہ سوم، مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڑھ، ۱۹۲۸ء، ص۔ ۲۳۴
۶۱۔ مرقع کانفرنس، ص۔ ۳۳۴ تا ص۔ ۳۴۵
۶۲۔ مرقع کانفرنس، ص۔ ۲۴۵ تا ص۔ ۲۵۷
۶۳۔ مرقع کانفرنس، ص۔ ۲۵۸ تا ص۔ ۲۶۹
۶۴۔ مرقع کانفرنس، ص۔ ۳۰۳ تا ص۔ ۳۰۵
۶۵۔ خطبات عالیہ اور علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، ص۔ ۴۱۳
۶۶۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، ص۔ ۴۲۵ ۶۷۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ۴۲۵۔
۶۸۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۵۰ ۶۹۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۶۶

مسلم قومی یکجہتی اور تحریک پاکستان کے آخری دس سال
(۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء)

سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ جس طرح مسلم لیگ کی تاریخ، دو قومی نظریہ کی آخری تشکیل، مستقبل میں ہندوستان کی اپنی حیثیت اور آزادی کے لئے مسلمانوں کی جد وجہد کے سلسلے میں خصوصیت سے ممتاز ہے، اسی طرح دس سال کا یہ عرصہ قومی زبان کے حوالے سے اردو ہندی تنازع کے سلسلے میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔

یہی وہ دور ہے جس میں مسلم لیگ نے یہ محسوس کیا کہ اس کے موقف کی وضاحت اور پروپیگنڈے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اردو کا کوئی اپنا اخبار ہو۔ یقیناً بعض اخبارات مسلم لیگ کی ترجمانی کر رہے تھے لیکن کوئی ایسا اخبار نہ تھا جسے اس کا ترجمان اور نمائندہ کہا جا سکے۔ نتیجہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کی روندادیں اس کے رہنماؤں کی تقریریں اور بیانات، ادھر ادھر منتشر، وقت ناوقت چھپتے تھے اور عوام تک دیر سے پہنچتے تھے، اس کمی کو دور کرنے کے لئے ضروری تھا کہ نشر و اشاعت کے نئے وسائل کے ذریعے مسلم لیگ کے پروپیگنڈے میں تیزی اور وسعت پیدا کی جائے چنانچہ اس کے لئے مسلم لیگ نے "منشور" نام کا ایک اردو اخبار نکالا۔ مولانا حسن ریاض لکھتے ہیں کہ:

> "۱۹۳۸ء میں میں نے یہ خدمت اپنے ذمے لی تھی کہ مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام، مسلمانوں کو سمجھاؤں اور مسلم لیگ پر مخالفین جو اعتراضات کریں ان کا جواب دوں۔ اسی غرض سے "منشور" جاری کیا گیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ مسلمانوں کے تصورات اور مقاصد کو معین صورت دے کر "منشور" میں صاف صاف بیان کروں۔ تاکہ کانگریس کے ان خیالات سے جو اس وقت ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے ذہن پاک ہوں۔"[1]

اسی زمانے یعنی اپریل ۱۹۳۹ء سے انجمن ترقی اردو نے اپنے کام کی وسعت اور اس کی اشاعت و تبلیغ کے پیش نظر "ہماری زبان" کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالنا شروع کیا۔

اسی زمانے میں مہاتما گاندھی نے زبان کے سلسلے میں ایک اور شوشہ چھوڑا۔ کانگریس نے فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان "ہندوستانی" ہوگی۔ گاندھی جی نے "بھارتیہ ساھتیہ پریشد" کے جلسے میں اسے "ہندی ہندوستانی" کر دیا۔ "ہندی ہندوستانی" کی وضاحت چاہی گئی تو ہندی اور ہندوستانی کو مترادف بتایا۔ جب اس وضاحت کے خلاف ہر طرف سے آواز بلند ہوئی تو ہندی یا "ہندی ہندوستانی" کو چھوڑ پھر "ہندوستانی" کی طرف رجوع ہوئے اور اردو والوں کو ایک نئے ڈھب سے فریب دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ایک معاھدے پر دستخط بھی کئے اور "ہندوستانی" کا معیار متعین کرنے کے لئے آل انڈیا ریڈیو، دھلی سے ہندوستانی کے موضوع پر، بعض اکابر مثلاً ڈاکٹر تاراچند، مولوی عبدالحق، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پنڈت برجموھن دتاتریا کیفی اور آصف علی سے تقریریں کرائی گئیں جو بعد کو کتابی صورت میں بھی شائع ہوئیں[۲۵]۔ لیکن چونکہ گاندھی جی کی کوئی تجویز، نیک نیتی پر مبنی نہ تھی اس لئے زبان کا مسئلہ سلجھنے کے بجائے روز بروز الجھتا گیا۔ ہندوؤں نے کھلم کھلا کہنا شروع کیا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی قومی زبان ناگری رسم الخط میں ہندی ہوگی اور مسلم لیگ نے تکلفات کو چھوڑ کر، واضح طور پر اپنی قرار دادوں میں اردو کی پوری حفاظت کرنے اور قومی زبان بنانے کا اعلان کیا۔ غرضیکہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی دس برسوں میں ہندی اردو کی لڑائی کئی محاذوں پر لڑی گئی اور اس شد و مد کے ساتھ کہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔

۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت فروری مارچ ۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلیوں کے لئے انتخابات منعقد ہوئے۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر باہمی مفاہمت کے ساتھ انتخاب میں حصہ لیا۔ مسلم لیگ چونکہ پچھلے کئی برسوں سے باہمی اختلافات کا شکار تھی، اور اس کے پاس نہ تو پروپیگنڈے کے لئے ذرائع تھے اور نہ مالی وسائل، اس لئے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ کانگریس کے امیدوار کئی صوبوں میں اکثریت کے ساتھ منتخب ہوگئے۔ یوپی، سی پی، بہار، مدراس، اڑیسہ اور بمبئی میں انھیں اکثریت حاصل تھی کہ وہ کسی دوسری جماعت کی مدد کے بغیر اپنی وزارتیں بنا سکتے تھے[۲۶]۔ دوسرے صوبوں مثلاً پنجاب، سندھ اور بنگال میں اگرچہ کانگریس کے نمائندوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، لیکن چونکہ بیشتر جماعتوں کے نمائندے انہیں کے زیر اثر تھے اس لئے ان میں کوئی مخلوط حکومت کانگریس کی حمایت کے بغیر آسانی سے نہ بن سکتی تھی۔ اس لحاظ

سے بر صغیر کے سارے صوبوں پر کانگریس راج کے لئے فضا ہموار تھی، چنانچہ جب حکومت نے کانگریس کو بمبئی، مدراس، سی پی، اور بہار وغیرہ میں اپنی صوبائی وزارتیں تشکیل دینے کی دعوت دی تو وہ تھوڑے سے قیل و قال کے بعد رضامند ہو گئی اور جولائی ۱۹۳۷ء میں ہندوؤں کی نمائندہ جماعت کانگریس نے چھ صوبوں میں خالص ہندوانہ وزارتیں قائم کر دیں۔[۱۳]

وزارتوں کی تشکیل سے قبل عام طور پر قیاس کیا جاتا تھا کہ بعض صوبوں خصوصاً یوپی میں جو وزارت قائم کی جائے گی اس میں مسلم لیگ کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے گی، یہ قیاس بے سبب نہ تھا کانگریس اور مسلم لیگ نے انتخاب میں حریفانہ انداز سے نہیں بلکہ دوستانہ ماحول میں حصہ لیا تھا۔ دونوں کا انتخابی منشور تقریباً ایک سا تھا بجز اس کے کہ مسلم لیگ نے اپنے منشور میں اردو اور اس کے رسم الخط کو بھی تحفظ دینے کا اعلان کیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی خیال تھا کہ پچھلے برسوں میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو نفرت پیدا ہو رہی تھی کانگریس، مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارت بنا کر اس نفرت کو کم کرنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن کانگریس نے اکثریتی قوت کے نشے میں مسلم لیگ کو در خور اعتنا نہ جانا، یوپی مسلم لیگ کو مولانا ابوالکلام آزاد کی معرفت، وزارت میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی گئی تو اس شرط کے ساتھ کہ مسلم لیگ اپنے وجود کو ختم کر کے، کانگریس میں ضم ہو جائے اور کانگریس کو بر صغیر کی واحد سیاسی نمائندہ جماعت تسلیم کر لے۔[۱۵] ظاہر ہے کہ مسلم لیگ خصوصاً یوپی مسلم لیگ اور وہاں کے مسلمانوں کے لئے یہ دعوت "نوید مسرت" نہیں خودکشی کی ترغیب تھی۔ حالانکہ یوپی اسمبلی میں مسلمان ممبر ایک دو نہیں چھیاسٹھ کی تعداد میں تھے اور مسلمانوں کی ملی تحریکوں پر ان کا اتنا گہرا اثر تھا کہ اگر انہیں کانگریس وزارت میں شامل کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس کا نہایت دور رس اثر پورے ہندوستان کی سیاست پر پڑ سکتا تھا لیکن کانگریس نے اپنی نخوت میں آکر مسلمانوں کو نظرانداز کر دیا، بقول عاشق حسین بٹالوی:

> "متعدد وجوہ سے یوپی کو ہندوستان کے تمام صوبوں میں قلب کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اول اس لئے کہ یہ علاقہ تین سو سال تک مغلیہ حکومت کے جاہ و جلال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کے آثار یہاں کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ دوئم اس لئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے ہندوستان کی صحیح تہذیب اور ادب نے اس خطے میں فروغ پایا تھا۔

سوم اس لئے کہ یوپی کے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیب و تمدن، علم و ادب اور قومی و ملی روایات میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ چہارم اس لئے کہ یہ صوبہ نہرو خاندان کا وطن ہونے کی وجہ سے کانگریس کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ان وجوہ سے تمام ہندوستان کی نظریں یوپی کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو معاملہ وہاں طے پائے گا اس کا عکس پورے بر عظیم پر پڑے گا۔[۷]

کم و بیش ایسا ہی ہوا، سمپورنانند نے اپنی سوانح عمری میں اعتراف کیا ہے کہ کانگریس نے ۱۹۳۷ء کی وزارتوں میں مسلم لیگ کو نظرانداز کر کے مسلمانوں کو اتنا دل برداشتہ کیا اور ہندی مسلم اتحاد کو ایسی ضرب کاری لگائی کہ مسلم لیگ اس کے بعد کانگریس سے کسی آئینی مسئلے پر مفاہمت کے لئے رضامند نہ ہوئی اور اس طرح جو باہمی اختلاف پیدا ہو گیا تھا وہ قیام پاکستان پر منتج ہوا۔ بعض دوسرے غیر مسلم مبصروں اور نیشنلسٹ مسلمان مصنفین نے بھی اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ سے رشتہ اتحاد ختم کر کے کانگریس نے نشۂ حکومت کا وقتی لطف تو اٹھا لیا لیکن اس کا خمار، بعد کو اسی کے حق میں مہلک ثابت ہوا۔

۱۹۳۷ء کی کانگریس حکومت اگرچہ سیکولر ہونے کی مدعی تھی لیکن اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بنکم چندر کے ناول "آنند متھ" کے ایک گانے "بندے ماترم" کو اپنا قومی ترانہ قرار دے دیا۔ اس ناول کے بارے میں پچھلے کسی باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کا مقصد مسلمانوں کے خلاف نفرت و جنگ جوئی کا جذبہ پیدا کرنا تھا، یہ انیسویں صدی میں لکھا گیا تھا۔ اور مسلمان اسی وقت سے اس کے خلاف احتجاج کرتے چلے آرہے تھے۔ "بندے ماترم" اسی ناول کی ایک "دعا" ہے، جس میں "کالی دیوی" کے سامنے ہاتھ جوڑ کر مسلمانوں کو مفتوح و مغلوب کرنے کی دعا مانگی گئی ہے۔ محمد داور حسین نے "بندے ماترم اور اس کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی ہے اس میں بندے ماترم کا اردو ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔ اور نواب صدیق علی خان نے "بے تیغ سپاہی" میں اس ترجمے کے بعض اجزا نقل کئے ہیں۔[۸]

ہونا یہ چاہئے تھا کہ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھ کر اس گانے سے گریز کیا جاتا لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس کو "قومی ترانہ" قرار دے کر ہندو، مسلمان دونوں کو اس

کے سننے اور پڑھنے پر مجبور کیا گیا۔ سارے اسکولوں اور کالجوں میں صبح کو یہ ترانہ بچوں اور نوجوانوں سے پڑھوایا جاتا اور مسلمان بچے بچیوں سے ان کے مذہبی عقاید کے خلاف اس کا احترام کروایا جاتا، ظاہر ہے کہ یہ رویہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد سے براہ راست متصادم تھا اس لئے کانگریس حکومت کی طرف سے ان کا شاکی ہونا ایک فطری عمل تھا۔ کانگریس نے بندے ماترم کو قومی ترانہ بنانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مرضی و منشا کے خلاف ایک حیرت انگیز قدم یہ اٹھایا کہ کانگریس کے ترنگے جھنڈے کو قومی پرچم قرار دے دیا نتیجتاً ہر ایک کے لئے اس کو سلامی دینا ضروری ہو گیا۔ سب کو معلوم تھا کہ "ترنگا جھنڈا۔ قومی جھنڈا نہیں بلکہ ایک سیاسی جماعت کا جھنڈا تھا۔ ملک کی دوسری سیاسی جماعتیں بشمول مسلم لیگ بھی اس طرح کے اپنے انفرادی پرچم رکھتی تھیں اور اس لئے عام خیال یہ تھا کہ جب ہندوستان کو خود مختاری ملے گی اور کوئی جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ساری جماعتوں اور پرچموں کے اشتراک سے کوئی پرچم تیار کیا جائے گا۔ لیکن کانگریس نے اس کا لحاظ کئے بغیر اپنا جماعتی پرچم، سارے ملک اور ساری قومیتوں پر مسلط کر دیا۔ عبدالوحید خان نے ڈاکٹر بینی پرشاد اور پروفیسر کوپ لینڈ کے تبصروں کے حوالے سے[۵] صحیح لکھا ہے کہ:

> "بندے ماترم" اور "ترنگے جھنڈے" کو کانگریس نے قومی ترانہ اور قومی پرچم بنا کر ہندو قوم پرستی اور مسلمان دشمنی کا ایسا عملی ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ مسلمانوں کا کانگریس سے قریب تر آنے کا اب کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔"

کانگریس کا ایک اور شاہکار، اس کا وہ تعلیمی منصوبہ ہے جسے تعلیمی دنیا میں "بنیادی قومی تعلیم (BASIC NATIONAL EDUCATION) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ دراصل گاندھی جی کے ذہن کی تخلیق تھا اور انہیں کے دئے ہوئے خاکے کے مطابق، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر ہندوستان) نے غلام السیدین اور سات دوسرے ہندو ممبروں کے ساتھ اس کی ایک مفصل رپورٹ مرتب کی تھی۔ یہی رپورٹ جس کا چوتھا ایڈیشن اس وقت میرے سامنے ہے[۶] ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ کہلائی اور بیسک نیشنل ایجوکیشن کے نام سے شائع ہوئی۔ چونکہ یہ اسکیم ابتداً وار دھا ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ اکتوبر، ۱۹۳۷ء کے تحت مہاتما گاندھی کی زیر صدارت منظور ہوئی تھی اس لئے عام طور پر اسے واردھا اسکیم کے نام سے پکارا گیا۔ ۲ دسمبر، ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی

رپورٹ، مہاتما گاندھی کی خدمت میں ایک خط کے ساتھ پیش کی اور مارچ ۱۹۳۸ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کر کے، نافذ کر دیا گیا۔ دوسرے ایڈیشن مطبوعہ اگست ۱۹۳۸ء میں مہاتما گاندھی کا مختصر پیش لفظ بھی شامل کر دیا گیا۔ اس رپورٹ کا اردو ترجمہ رسالہ جامعہ دھلی، بابت جنوری ۱۹۳۸ء میں پہلے ہی شائع ہو چکا تھا۔

یہ اسکیم دو بنیادی نظریات کے تحت مرتب کی گئی تھی ایک عدم تشدد، دوسرے وطن پرستی۔ یہ دونوں باتیں اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے نظریات کی ضد تھیں۔

کانگریس راج میں ہندو مہاسبھا ہر قسم کی قانونی پابندی سے آزاد ہو گئی۔ وی ڈی ساورکر، ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی کانگریس کے پورے دور حکومت میں ہندو مہاسبھا کے صدر رہے۔ ان کا نقطہ نظر مسلمانوں کے متعلق یہ تھا، کہ وہ ملیچھ ہیں، غیر ملکی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے دشمن ہیں، ہندوستان کی قومیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں کو ہندوستان کی آزاد حکومت میں کوئی حصہ نہیں ملنا چاہیئے، اگر انہیں ہندوستان میں رہنا ہے تو انہیں ہندو تہذیب میں پوری طرح ڈھل جانا چاہیئے۔ اور ہندو کے رحم و کرم پر زندگی گذارنا چاہیئے۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار انہوں نے ایک جگہ اور ایک بار نہیں، جگہ جگہ بار بار کیا۔ ۱۹۳۷ء میں، ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں ہندو مہاسبھا کے سالانہ اجلاس علی الترتیب، احمد آباد، ناگپور اور کلکتے میں منعقد ہوئے۔ تینوں جگہ اپنے صدارتی خطبے میں انہوں نے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا۔ احمد آباد کے اجلاس میں انہوں نے کہا:

"ہندوستان کی سرزمین پر صرف ہندوؤں کا حق ہے۔ مسلمان، بدیسی اور غدار ہیں۔۔"

ناگپور کی تقریر میں انہوں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دینے اور ان کو بیرونی مسلمانوں کی مدد سے محروم رکھنے کی ایک جارحانہ اسکیم کا اعلان کیا۔ کلکتے کے خطبے میں انہوں نے کہا کہ:

"ہندوستان میں خالص ہندو راج قائم کیا جائے اور سنسکرت آمیز ہندی کو ناگری رسم الخط میں ملک کی قومی زبان بنا دیا جائے۔"[۱]

کانگریسی حکومت کی در پردہ شہ اور تجاہل عارفانہ کے نتیجے میں یہ ہوا کہ مہاسبھا کے احکام اور پروگرام کے مطابق ہندوؤں نے مسلمانوں کو حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مداخلت کی۔ اذان اور نماز کے

وقت مسجدوں کے سامنے باجے بجا کر جذبات کو مجروح کیا اور اگر کسی طرف سے روک ٹوک ہوئی تو لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ کانگریس نے اپنی حکومت میں مسلمانوں کی جان ضیق میں کر دی۔ یہ تو کہئے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور حالات ایسے ہو گئے کہ کانگریس حکومتوں کو اس کے بعد ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مستعفی ہو جانا پڑا۔[۱۲]

کانگریس حکومت نے شدائد و مظالم کا یہ سارا طوفان چند مہینوں کے اندر بپا کر دیا۔ جمہور آل انڈیا مسلم لیگ نے سارے واقعات کا جائزہ لینے اور زیادتیوں کی نوعیت کا سراغ لگانے کے لئے اکتوبر ۱۹۳۷ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنو میں ایک تحقیقی کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کمیٹی پیرپور کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی کیونکہ اس کے چیرمین، پیرپور کے راجہ سید محمد مہدی تھے۔ کمیٹی نے اپنی مفصل رپورٹ کی تیاری میں تقریباً ایک سال کا وقت لیا۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں یہ رپورٹ سینتالیس صفحوں پر ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی، یہ تین حصوں پر مشتمل تھی پہلے حصے میں عمومی جائزہ تھا۔ دوسرے حصے میں ہندو مسلم نزاع کی نوعیت اور اس کے اسباب اور تیسرے حصے میں مسلمانوں پر حکومت کے مظالم کی تفصیلات درج ہیں۔ پہلے حصے یعنی عمومی جائزے کا خلاصہ اس طور پر درج ہے:

"ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلے نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ جس کا کوئی تصفیہ نظر نہیں آتا۔ بعض حلقوں کے نزدیک اس قسم کا اعلان کر دینا کافی ہے کہ اقلیتوں کو مطمئن رہنا چاہئے کہ ان کے زبان، کلچر اور مذہب بالکل محفوظ ہیں، گویا اقلیتوں کو اس اعلان کے بعد اور کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت نہیں۔ یہ انداز فکر بالکل غلط ہے۔ کانگریس نے اگرچہ اپنے اندر چند مسلمانوں، سکھوں اور مسیحیوں کو بھی شامل کر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ کانگریس سراسر ہندوؤں کی جماعت ہے"[۱۳]

کانگریس کے مظالم کے سلسلے میں میں پیرپور کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر آئی تو کانگریس کے ممتاز رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اور بعض دوسروں نے اس میں مندرج واقعات کی صحت سے انکار کیا۔ اس پر بنگال کے مولوی فضل الحق اور پنڈت نہرو کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ آخر کار مولوی فضل الحق نے ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کے اخبار "اسٹیٹس

مین میں ایک مفصل مضمون لکھا اس میں انھوں نے ان مسلم کش واقعات و فسادات کا کامل جائزہ لیا، جو کانگریس کے دور حکومت میں بہار، سی پی اور یوپی میں رونما ہوئے تھے۔ پورا مضمون تقریباً پچاس صفحوں پر مشتمل ہے اور اس کا اردو ترجمہ، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب، "ہماری قومی جدوجہد۔ (جنوری ۱۹۳۹ء سے دسمبر ۱۹۳۹ء) میں درج کر دیا ہے۔ اس مضمون کی چند ابتدائی سطریں دیکھئے:

"دو سال سے کچھ اور مدت گذر چکی ہے میرے پاس ایسی دستاویزیں موجود ہیں جن میں ان مظالم کی خون چکاں روانداد درج ہے، جن کا ہندوستان کے کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ کانگریس نظم و نسق کے تحت جتنے فسادات ہوئے اور ان فسادات میں مسلمانوں کا جس قدر مالی اور جانی نقصان ہوا، اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ملتی۔

کانگریسی وزارتوں نے حکومت سنبھالتے ہی بعض عجیب و غریب حرکتیں کیں۔ مثلاً یہ کہ سرکاری افسروں کے نام احکام جاری کئے گئے کہ اہم انتظامی امور میں کانگریس کمیٹی کے ممبروں سے مشورہ کیا جائے۔ سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں پر کانگریس کا ترنگا پرچم لہرایا جائے۔ سرکاری و نیم سرکاری مجمعوں میں بندے ماترم گایا جائے۔ ہندی زبان اور ہندوؤں کے کلچر کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہندوؤں کو محسوس ہوا کہ وہ رام راج آگیا جس کا انہیں مدت سے انتظار تھا۔ وہ بے بس مسلم اقلیت کو ایسی حقارت سے دیکھنے لگے جیسے ہومر کے زمانے میں ایک دیو سائیکلوپس کمزور اور منحنی انسانوں کو دیکھا کرتا تھا۔ سائیکلوپس کی طرح وہ بھی صرف ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ ان کی دوسری آنکھ جو انہیں حق انصاف اور مساوات کی آگہی عطا کر سکتی تھی۔

اور یہ باور کرا سکتی تھی کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان تعداد میں کم ہیں تاہم اپنے حقوق تو رکھتے ہیں۔ یہ تھی وہ فضا جس میں ہندوؤں نے مسلم اقلیتوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا آغاز کیا۔

اور ان کی مرضی کیا تھی؟ گئو ماتا کا تحفظ لازمی ہے۔ مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے کی ہرگز اجازت نہ دینا چاہئے۔ مسلمانوں کے مذہب کو

ضرور ذلیل کرنا چاہئے۔ اذان کی ممانعت کر دینی چاہئے۔ عین نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے باجے گاجے اور ڈھول ڈھمکے کا جلوس نکالنا ضروری ہے۔ ہندی زبان اور ہندوؤں کا کلچر، مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہئے۔ قبرستانوں مسجدوں، امام باڑوں کی بے حرمتی کرنی چاہئے۔ پھر اس میں تعجب ہی کیا ہے کہ اس ماحول میں المناک حادثوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ دیہاتی علاقے خوف و ہراس اور دہشت کی کمین گاہ بن گئے۔ کہیں کہیں یہ بھی ہوا کہ مظلوم بالآخر مقابلے پر ڈٹ گئے اور تمام فسادات یک طرفہ نہ رہے۔ لیکن یہ بالکل ایسی بات ہوگی جیسے کوئی جرمن مورخ پولینڈ کے باشندوں پر الزام لگانے کہ انہوں نے جرمن کی حملہ آور فوجوں کا کیوں مقابلہ کیا تھا؟[۱۴]

بعد ازاں ۱۹۴۱ء میں حکیم اسرار احمد کریوی کی مرتبہ کتاب "سی پی میں کانگریس راج" شائع ہوئی۔ پونے چار سو صفحات کی اس کتاب میں مرتب نے سی پی میں کانگریس کے ظلم و ستم کی مفصل داستان، دستاویزی شہادتوں کے ساتھ بیان کی ہے۔

ان رپورٹوں کا یہ اثر ہوا کہ برصغیر کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی شدید لہر سی دوڑ گئی اور ان کے دل میں یہ خیال، کہ ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں ہیں اور اب وہ مل کر نہیں رہ سکتیں، ہمیشہ کے لئے مستحکم ہوگیا۔ اس دو قومی نظریے کے سلسلے میں سر سید احمد خاں، عبدالحلیم شرر اور جسٹس امیر علی وغیرہ کے خیالات کا تذکرہ اس سے پہلے کہیں آچکا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔"[۱۵]

۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے ہندوستان کے اندر ایک مسلم ریاست کے لئے "پاکستان" کا نام بھی تخلیق کر لیا تھا اور پاکستان اسپیشل موومنٹ کے بانی کی حیثیت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ:

پانچ مسلم اکثریتی وحدتوں پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک علیحدہ وفاق قائم کیا جانے۔[۱۲]

چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں نے جب ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت منتخب ہونے والی کانگریسی وزارتوں کا رویہ دیکھ لیا اور بے شمار مسلمان کش واقعات ان کے تجربے میں آگئے، تو متحدہ ہندوستان اور متحدہ قومیت پر جوان کا تھوڑا بہت ایمان باقی تھا وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ ان میں خود کو منظم کرنے اور جلد سے جلد اس صورت حال سے نجات پانے کے لئے عجیب بے چینی پیدا ہوگئی۔ ان کے ذہنوں کو سر سید احمد خاں، علامہ اقبال اور چودھری رحمت علی کے خیالات اس شدت سے پریشان کرنے لگے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے فیصلہ سے پہلے سندھ کی صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء زیر صدارت قائداعظم محمد علی جناح حسب ذیل قرارداد منظور کر دی گئی:

"سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس وسیع و فراخ براعظم ہند کے قیام امن کے مفاد میں اور بے روک ٹوک ثقافتی تعمیر و ترقی، معاشی اور سماجی بہبود اور دونوں قوموں کی جو ہندو اور مسلمانوں کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں، سیاسی حق خودارادی کے مفادات کے پیش نظر یہ چیز قطعی طور پر ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان، دو وفاقوں میں تقسیم کر دیا جانے، یعنی مسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق۔ چنانچہ یہ کانفرنس کل ہند مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ دستور کی ایک ایسی اسکیم وضع کرے جس کے تحت مسلم اکثریتی صوبے، مسلم دیسی ریاستوں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت میں آبادی ہے۔ ایک اپنے ذاتی وفاق کی شکل میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہندوستانی سرحدوں کے اس بار واقع دوسری کسی بھی مسلم ریاست کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اس وفاق میں شامل ہو سکے اور غیر مسلم اقلیتوں کے لئے ہر قسم کے تحفظات کے ساتھ، جس قسم کے تحفظات ہند کے غیر مسلم وفاق میں مسلم اقلیتوں کے لئے کئے جا سکتے ہوں۔[۱۷]

غرض کہ مسلمانوں پر ایک عالم اضطراب طاری تھا۔ سب کی نظریں قائداعظم پر لگی ہوئی تھیں، وہ اس خواہش و آرزومندی کے ساتھ ان کو تک رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے

مستقل تحفظ کے لئے کوئی قدم اٹھائیں۔ قائداعظم نے بھی ملت کی نبض کو ٹول لیا۔ بقول مولانا حسن ریاض، قائداعظم کے مزاج کا خاصہ تھا کہ وہ عوامی تقاضوں کو نظر میں رکھ کر آگے قدم بڑھاتے تھے[۱۸] ۔چنانچہ مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام نئے جوش و خروش، نئے انداز، اور نئے تقاضوں کے ساتھ شروع کیا گیا۔آل انڈیا مسلم لیگ کے دو سال میں تین سالانہ اجلاس ہوئے ۔ پہلا اجلاس ۱۵اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنو میں ۔ دوسرا ۱۷اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتے میں اور تیسرا ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کو پٹنہ میں[۱۹] ۔ ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت کانگریس وزارتوں سے جو تلخ تجربات ہوئے تھے ان کی بنا پر مسلم لیگ نے طے کر لیا کہ وہ آل انڈیا فیڈریشن کو آئندہ کسی طرح بھی قبول نہیں کرے گی۔ طبعاً سوال پیدا ہوا کہ کونسی متبادل اسکیم سامنے رکھی جائے ۔اس کے لئے ایک آئینی کمیٹی اس غرض سے تشکیل دی گئی کہ وہ اس مسئلے پر لوگوں کی تجاویز پر غور کرے اور کوئی حل تلاش کرے ۔ کمیٹی کے سامنے پانچ تجویزیں پیش ہوئیں:

۱۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالطیف کی اسکیم۔

۲۔ میاں کفایت علی کی مرتبہ اسکیم جو مصنف کے نام کے بجائے "ایک پنجابی" کے نام سے شائع کی گئی۔

۳۔ چودھری رحمت علی کی اسکیم جس میں پہلی بار پاکستان کا لفظ استعمال ہوا تھا۔

۴۔ علیگڑھ کی اسکیم جسے ڈاکٹر افضال حسین قادری اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے مرتب کیا تھا۔

۵۔ سر سکندر حیات خان کی اسکیم جو عام طور پر زونل اسکیم کے نام سے مشہور ہے۔

۱۹۳۹ء کا پورا سال ان تجویزوں پر غور کرنے اور اس فکر و اضطراب میں گزر گیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق کو محفوظ کرنے اور انہیں ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لئے کس قسم کا دستور مرتب کرنا چاہیئے؟ آخر کار مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں قائداعظم کی صدارت میں ہوا۔ اس میں ۲۳ مارچ کو ایک تاریخی تجویز "قرارداد پاکستان" کے نام سے منظور ہوئی

اس اجلاس میں قائداعظم نے دو قومی نظریے کے بارے میں یہ بات بھی

واضح کر دی کہ:

"ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس مسئلے کو بین الاقوامی مان کر حل کرنا چاہئے اگر برطانوی حکومت یہ چاہتی ہے کہ ہندوستانیوں کو امن اور سکون حاصل ہو تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے جداگانہ قومی وطن منظور کئے جائیں۔ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہیں بنے۔ نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ایسی تہذیبوں کے ماننے والے ہیں، جن کی بنیاد متصادم افکار و تصورات پر ہے۔ ان کے کارنامے مختلف ہیں، اکثر واقعات ایک کا ہیرو، دوسرے کا دشمن ہوتا ہے۔ ایک کی فتح، دوسرے کی شکست ہے۔ ایسی قوموں کو ایسے نظام میں باندھنا جس میں ایک اقلیت ہو، دوسری اکثریت، بے چینی کا سبب ہو گا اور بالآخر وہ نظام تباہ ہو جائے گا۔"[۱۱]

۱۹۴۰ء کی "قرار داد پاکستان" نے مسلم لیگ اور مسلم لیگ کی معرفت مسلمانان برصغیر کا رخ کلی طور پر، اس انقلابی نصب العین کی طرف پھیر دیا جس میں سرسید احمد خاں اور علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر مضمر تھی نئی امنگوں اور تازہ ولولوں کے ساتھ کام شروع کیا گیا لیکن اس کی مخالفت ومزاحمت بھی اتنی شدت سے کی گئی کہ اس سے پہلے مسلم لیگ کے کسی موقف کی نہ ہوئی تھی۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان کا نام سن کر کانگریس اور دوسرے ہندو حلقوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈر مخالفت کے لئے میدان میں آگئے۔ ساتھ ہی ساتھ جمعیت العلمائے ہند کے بعض عالموں کو انہوں نے اس طرح اپنا ہمنوا بنالیا کہ دو قومی نظریے کی زیادہ مخالفت انہیں کی طرف سے ہوئی۔ قوم، قومیت اور قومیت کے عناصر پر دھواں دھار مخالفانہ تقریریں کی گئیں، مضامین لکھے گئے۔ شرعی نقطہ نظر سے ان کی تشریحات کی گئیں اور عام مسلمانوں کو مسلم لیگ اور دو قومی نظریے سے بدظن کرنے کے لئے یہ باور کرانے کی سعی کی گئی کہ "دو قومی نظریہ اسلامی تعلیمات اور دینی نقطہ نظر کے منافی ہے"۔ مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا ظفر احمد انصاری اور بعض دوسرے علما اور دانشوروں کی طرف سے اس کی تردیدیں شائع ہوئیں۔ ہندو مہاسبھا جیسی مسلمان دشمن

جماعتوں نے مسلم لیگ اور اس کے حامیوں پر غداری کا الزام لگایا اور مسلمانوں کو پاکستان کے خیال سے باز رکھنے کے لئے ہراساں کیا اور طرح طرح کی جارحیت اور تشدد کا نشانہ بنایا لیکن قائداعظم کی بردباری اور مسلمانوں کی عام سیاسی بیداری کے سبب مسلم لیگ سارے حربوں کو جھیل گئی۔ حریفوں کی کوئی چال کامیاب نہ ہوئی اور اپنی منزل کی سمت مسلم لیگ کا قدم روز بروز آگے بڑھتا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے درمیان حکومت نے سیاسی جماعتوں پر اگرچہ سختیاں کیں اور پابندیاں لگائیں، لیکن تحریک آزادی پر کوئی فرق نہ پڑا۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی طرف سے آزادی کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا، لیکن اب ان کے مطالبات کی سمتیں ایک دوسرے سے اتنی مختلف تھیں کہ آئین آزادی کی کسی تجویز پر دونوں کا متفق ہونا مشکل تھا۔ کانگریس اور اس کے کرتا دھرتا مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کا خیال ناقابل فہم اور ناممکن العمل ہے۔ میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہوا تو میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔ میں تقسیم کو گناہ سمجھتا ہوں اور اس جرم میں شریک نہیں ہو سکتا۔ [۴۴] قائداعظم اور مسلم لیگ حتمی اور آخری فیصلے کے طور پر اعلان کر چکی تھی کہ تقسیم ہندوستان کے سوا کسی طرح کوئی اور آئینی فیصلہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا، پھر بھی آزادی اور ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں ساتھ ساتھ جاری رہیں۔ ۱۹۴۲ء میں اسٹیفورڈ کرپس، آزادی ہند کے لئے بعض تجویزیں لے کر آئے، مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اسے بعض وجوہ سے مسترد کر دیا۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں چکرورتی راج گوپال اچاریہ نے گاندھی جی کے مشورے سے ایک فارمولا بنایا۔ تحریک پاکستان کی تاریخ میں یہ "سی آر فارمولا" کہلاتا ہے ہرچند کہ یہ فارمولا مسلم لیگ کے لئے پوری طرح قابل قبول نہ تھا لیکن چونکہ اس میں تقسیم ہند کو اصولاً مان لیا گیا تھا اس لئے کانگریس نے اسے مسترد کر دیا۔ ۱۹۴۴ء میں مہاتما گاندھی اور قائداعظم کے درمیان گفت و شنید ہوئی لیکن بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس ساری کشمکش اور سارے عرصے یعنی ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۵ء کے انتخابات سے قبل تک ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بحث کا خاص موضوع دو قومی نظریہ رہا۔ قوم کسے کہتے ہیں؟ قومیت کیا ہے؟ اور اس کی تشکیل و تعمیر میں کون کون سے عناصر کام کرتے ہیں؟ ان سوالوں کے جوابات کی تلاش میں جگہ جگہ مناظرے اور مباحثے ہونے اور مضامین و مقالات لکھے گئے۔ قوم اور قومیت کے الفاظ کی لسانی و اصطلاحی تشریحات کا ایسا سلسلہ چھڑ گیا کہ قیام پاکستان سے پہلے نہ ختم ہوا۔ ظاہر

ہے کہ ایسے میں زبان، قومی زبان اور ہندی اردو کا مسئلہ بھی بطور خاص زیر بحث آیا۔ اس لئے کہ زبان کو نظر انداز کر کے قوم، قومیت اور قومی نظریے کی تشکیل کی کوئی تعریف یا ہیئت متعین ہی نہ ہو سکتی تھی۔

یوں تو اردو ہندی کا جھگڑا ایک مدت سے چلا آرہا تھا لیکن بقول شخصے اب اس میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ کوئی جلسہ ہو، کوئی سبھا ہو، کوئی انجمن ہو، کوئی میٹنگ ہو، اس کی پرچھائیں سے نہ بھاگ سکتی تھی۔ ۴۴ بحث میں الجھاؤ اور شدت دراصل اس وقت پیدا ہوئی جب گاندھی جی نے انڈین نیشنل کانگریس کی قرارداد سے تجاوز کر کے بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور کے جلسے میں لفظ "ہندوستانی" پر "ہندی" اضافہ کیا اور اور ہندوستان کی مجوزہ قومی زبان کو "ہندی ہندوستانی" کا نام دیا۔ وضاحت طلب کرنے پر کہا "ہندی ہندوستانی" سے مراد "ہندی" ہے، اور اس کا رسم الخط ناگری ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے کسی جگہ ذکر آچکا ہے۔ اردو کے بارے میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ اردو، مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان ہی اس کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔

کانگریس کی قرارداد میں "ہندوستانی" کی تعریف یہ بتائی گئی تھی کہ:

"یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ناگری و فارسی رسم الخط دونوں میں لکھی جاتی ہے"۔

لیکن مہاتما گاندھی نے "ہندوستانی" کی اس تعریف کو نظر انداز کر کے ہمیشہ ایک ایسی زبان کی ایجاد و ترقی کے لئے کوشش کی جو واضح طور پر سنسکرت آمیز ہندی تھی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ساہتیہ پریشد کے جلسے میں ہندوستانی کے نام سے جو خطبہ دیا وہ ایسی ٹھیٹھ ہندی میں تھا کہ مسلمان تو مسلمان خود عام ہندو بھی اسے پوری طرح نہ سمجھ سکتے تھے۔ مولانا نیاز فتح پوری نے "گاندھی جی کی بانی" کے نام سے اس وقت اپنے رسالے میں گاندھی جی کا یہ خطبہ پورے کا پورا شائع کر دیا تھا اس کی صرف ابتدائی سطریں بطور نمونہ دیکھئے:

"اس سبھا کا پتیتو مجھے دینے کا کارن، جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں، ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا۔ تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے، اور بھوشیہ

میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائیں گے۔ یدی ہم شری نگر سے کنیاکماری تک،
کراچی سے لے کر ڈبرو گڑھ تک، بھو پردیش سے اسے ایک مانتے ہیں
اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک
بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری، اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں
اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی سیتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں۔"

علامہ نیاز فتح پوری نے اپنے مبصرانہ نوٹ میں اس خطبے کے بارے میں کہا تھا کہ
"اگر قارئین نگار اس کو سمجھ نہ سکیں تو اس کی ذمہ داری گاندھی جی کے
سر نہیں۔ کیونکہ ان کا مقصود تو یہی تھا کہ کوئی مسلمان اسے پڑھ بھی نہ
سکے۔ سمجھنے کا کیا ذکر ہے۔ یہ وہ زبان ہے جسے مشترکہ زبان سمجھنے پر
اصرار کیا جاتا ہے اور یہ وہ لٹریچر ہے جسے "سخن گسترانہ۔ طور پر غالب
کے جواب میں بجائے نظم کے نثر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مرزا نوشہ
ہوتے تو پوچھتے "یہ انداز گفتگو کیا ہے؟ ہم اس کے اعتراف میں
سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ بیشک عربی، فارسی کے الفاظ قابل
ترک ہیں اور یہ "دیو بانی" لائق احترام ہیں۔"

مہاتما گاندھی کے اس طرز عمل کا اثر، کانگریس اور اس کے سارے کارخانے
پر یہ پڑا کہ ہر شخص، "ہندوستانی" کی جگہ "ہندی" کا لفظ استعمال کرنے لگا اور قومی زبان کا
معیار وہ قرار پایا جو گاندھی جی نے اپنے خطبے میں پیش کیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد
کانگریس اور ہندی کے حامیوں کی طرف سے قومی زبان کے سلسلے میں جو نعرہ لگایا گیا وہ
"ہندوستانی" کا نہیں "ہندی" کا تھا اور اس مہم میں صرف ہندو مہاسبھا یا متعصب ہندو
جماعتوں کے ارکان نہیں بلکہ کانگریس کے سارے نامور لیڈر شامل تھے۔

پنڈت نہرو نے ستمبر ۱۹۳۶ء میں مدراس میں ہندی پرچار سبھا کی نئی عمارت کا
افتتاح کرتے ہوئے کہا:

"دکن میں ہندی پرچار کا سوال بہت اہم ہے۔ ہندی کے ذریعے سے
قومی تحریکوں کو بڑی تقویت پہنچ سکتی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ پرانی
زبانوں کی بنیادیں مضبوط کی جائیں اور انہیں کے ذریعے تعلیم عام کی
جائے، لیکن پورے ملک کا احاطہ کرنے اور مختلف علاقوں میں باہمی

تعلق پیدا کرنے کے لئے ہندی کو رواج دینا چاہئے۔ ہندوستان کے دو
تہائی حصے میں ہندی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ صرف ایک تہائی حصے
میں اسے پھیلانا ہے اس لئے اگر آپ ہندی کو اختیاری مضمون کی
حثیت سے سیکھ لیں تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ پبلک جلسوں کی کارروائی
ہندی میں ہی ہوتی ہے۔ کانگریس کے اجلاسوں میں دکن والے پیچھے
رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ ہندی نہیں سمجھتے۔ یوں بھی آپ کا ہندی سیکھنا
لازمی ہو جاتا ہے۔[۲۵]

۲۰ فروری ۱۹۳۸ء کو راشنر بھاشا کے ایک اجلاس کے موقع پر جو کہ انڈین نیشنل
کانگریس کے پنڈال میں ہوا تھا، کانگریس کے صدر سبھاش چندر بوس نے اپنے ایک
پیغام میں کہا کہ:

"ہندوستان کی مشترک زبان صرف ہندی ہو سکتی ہے۔ جنہوں نے اب
تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنا چاہئے کیونکہ یہ ہندوستانی قوم بنانے
میں مدد دے گی۔"

جمنا لال بزاز نے اپنے خطبہ صدارت میں ایک مشترک زبان یعنی ہندی کی
ضرورت پر زور دیا اور کہا:

"ہندی کی اشاعت، سوراج حاصل کرنے کے لئے لازمی ہے۔"

اس اجلاس میں ایک ریزولیوشن بھی بالاتفاق منظور ہوا کہ:

"ایسے تمام ادارے جن کا تعلق ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ہے
اپنے کاروبار اور مراسلت میں ہندی زبان استعمال کریں۔"[۲۶]

مسٹر بی جی کھیرے، وزیر اعظم بمبئی، نے ۱۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں "ہندی سکشا
پرچارک سبھا" کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"کسی کو اس بارے میں مطلق اختلاف نہیں کہ ہندوستان کی ایک
مشترک زبان ہونی چاہئے اور سب نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ وہ
مشترک زبان ہندی ہے۔"[۲۷]

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں بابو راجندر پرشاد، صدر، آل انڈیا ہندی پرچار سمتی نے ناگپور
میں ہندی زبان کی اشاعت سے متعلق ایک بڑے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"اٹھارہ سال پہلے ہندی ساہتیہ سمیلن نے اندور کے اجلاس میں

مہاتما گاندھی کی زیر صدارت یہ قرار داد منظور کی تھی کہ غیر ہندی داں صوبوں میں ہندی زبان کی اشاعت کا کام شروع کیا جائے، چنانچہ احاطہ مدراس میں یہ کام شروع کیا گیا اور جنوبی ہند کے کچھ پر جوش صاحبوں نے ہندی سیکھ لی۔ کچھ دنوں بعد یہ کام مقامی اصحاب ہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا، چنانچہ ایک مجلس دکشنا بھارت پرچار سبھا کے نام سے مدراس میں قائم کی گئی۔ اس کی غیر معمولی کامیابیوں کو دیکھ کر ساہتیہ سمیلن کے اجلاس ناگپور (اپریل ۱۹۳۶ء) میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندی کی اشاعت کے کام کو دوسرے غیر ہندی داں علاقوں میں پھیلایا جائے۔ یہ علاقے مہاراشٹر، گجرات، سندھ، بنگال اور آسام کے علاوہ سنتھال پرگنہ اور چھوٹا ناگپور اور بہار وغیرہ ہیں۔ یہاں کے لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں مگر یہاں ہندی کا رائج کرنا ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے سمیلن نے ایک خاص کمیٹی بنائی ہے جس کا دفتر واردھا میں ہے اور اس مقصد کے لئے ان صوبوں میں مجلسیں قائم کر رہی ہیں۔

یہ محسوس کیا گیا ہے کہ قومیت کے ان رشتوں کو مضبوط کرنے اور باہم جوڑنے کے لئے، جو اس ملک میں مختلف طریقوں سے بنائے جا رہے ہیں ایک ایسی مشترک زبان کا ہونا لازمی ہے۔ ایک غیر زبان سے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی قوم کے عزیز خیالات و جذبات کو صحیح طور سے ادا کر سکے اور ہماری تہذیب و تمدن کا یہ تقاضا ہے کہ ہماری ایک ایسی زبان ہو جو نہ صرف کسی فرقے یہ صوبہ کے لئے کار آمد ہو بلکہ بہ حیثیت مجموعی سارے ملک کے کام آسکے اس غرض کے لئے ہندی زبان سب سے زیادہ موزوں ہے۔[۲۸]

مئی ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس، بابو پرشوتم داس ٹنڈن کی صدارت میں ہوا۔ اس میں ہندی کی حمایت میں متعدد قرار دادیں منظور کی گئیں لیکن ہندی کے سوا ایک جگہ بھی "ہندوستانی" کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ قرار دادیں دیکھئے:

۱۔ نیشنل کانگریس صوبوں میں صدر مجلس وضع قوانین کے ارکان سے درخواست کی جائے کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں اس قسم کی تبدیلی کی تحریک کریں کہ جس سے ان کونسلوں کی کارروائی ہندی زبان

میں ہوا کرے، نیز یہ طے پایا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ اپنی تمام کارروائی ہندی میں کیا کرے۔

۲۔ ریلوے حکام سے تحریک کی جائے کہ ریلوے ٹائم ٹیبل، نقشے، قواعد اور ٹکٹ سب ہندی میں ہوں۔

۳۔ کوچین، تراونکور اور میسور کے حکام سے جنہوں نے اس سے قبل اپنی اپنی ریاستوں میں ہندی کے پروپیگنڈے میں بہت بڑی مدد دی ہے، یہ درخواست کی جائے وہ ریاست کے مدارس میں ہندی کی تعلیم کو لازمی قرار دیں۔

۴۔ یونیورسٹی اور انٹرمیڈیٹ بورڈ سے درخواست کی جائے کہ ہندی شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ کو اپنے نصاب تعلیم میں داخل کریں۔

۵۔ کانگریس پارٹی کے لیڈر اور سرحد کے وزیراعظم ڈاکٹر خان صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ حکومت سرحد کے اس سرکلر کو منسوخ کرانے کی کوشش کریں جو ہندی اور گورمکھی کے خلاف نافذ کیا گیا تھا۔

۶۔ نظام حیدر آباد سے درخواست کی جائے کہ ہندی کو ریاست کی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے[۲۵]

ہندی کے مبلغ اور اردو کے دشمن، کاکا کالیکر صاحب دسمبر ۱۹۳۶ء میں لاہور گئے اور ہمایوں کے مدیر میاں بشیر احمد کے مکان پر مولانا ظفر علی خان سے اردو کے مسئلے پر بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی، اس کے آخر کے چند جملے دیکھیے:

مولانا ظفر علی خان:

چوتھی چیز جو قومیت کے لئے ضروری ہے وہ زبان ہے۔

کاکا کالیکر:

اسی لئے تو ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی قومی زبان ایک ہو جائے۔

مولانا:

تو آپ کے نزدیک وہ کونسی زبان ہے؟

کاکا جی:

یہی جو ہم آپ بولتے ہیں۔

مولانا:

"میرا مطلب یہ ہے کہ اس کا نام کیا ہے؟"

کاکا جی :

"ہندی"

مولانا :

"اور اس کا نام اردو کیوں نہیں؟"

کاکا جی :

"یہ ایک فرقے کی زبان کا نام بن چکا ہے اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے"[33]

کاکا کالیکر ہی نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں ہندی کی اشاعت و تبلیغ کے لئے "ہندی پرچار جاتری" کے نام سے ایک کمیٹی قائم کی، اس کا مقصد ایشیا کے بعض ممالک میں ہندی کے مبلغین کو بھیجنا اور وہاں کے لوگوں کو ہندی کی ترغیب دلانا تھا۔ اس کمیٹی میں کاکا کالیکر، سیٹھ جمنا لال بزاز، بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور بابو راجندر پرشاد وغیرہ شامل تھے۔ کاکا کالیکر کے بیان کے مطابق:

> "سمیلن نے جو ہندی پرچار سمتی قائم کی ہے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک جاتری منڈل، برما، ملایا، جاوا اور سیام وغیرہ کو بھیجا جائے۔ جن ممالک کے سفر کا تہیہ کیا گیا ہے انہیں ہندوستان سے قدیمی تعلق ہے۔ پرانے زمانے میں انہوں نے سنسکرت سیکھ کر اور بودھوں کے عہد میں پالی کے ذریعے انہوں نے ہندوستان سے اپنا رشتہ قائم کیا۔ اب ہمیں انہیں سمجھانا ہے کہ وہ ہندی زبان کے وسیلے سے جسے تمام ہندوستان نے متفقہ طور پر قومی زبان تسلیم کر لیا ہے، اپنے پڑوسی ہندوستان کو پہچانیں"[34]

خود مہاتما گاندھی نے ہندی اور ہندوستانی کے موضوع پر اس زمانے میں متعدد مضامین لکھے اور بیانات شائع کرائے۔ ان کی نیت چونکہ قومی زبان کے سلسلے میں صاف نہ تھی، اس لئے ان کے مضامین و بیانات سے سلجھنے کے بجائے بات الجھتی ہی چلی گئی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں میں وہ تنہا آدمی تھے جو زبان کے مسئلے کو اپنی تقریر و تحریر کا موضوع بنائے ہوئے تھے۔ ایک بات کہتے اور جب اس کی مخالفت شروع ہوتی تو اس سے انکار کر کے کوئی دوسرا شوشہ چھوڑ دیتے۔ خود ڈاکٹر تارا چند اور بعض دوسرے مصنفین نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ زبان کے مسئلے میں ناقابل حل

پیچیدگی اس وقت سے پیدا ہوئی جب گاندھی جی نے ہندوستانی کو "ہندی اتھوا ہندوستانی" سے بدل دیا اور پھر اس کی بے جا تاویلات میں خود بھی الجھے رہے، دوسروں کو بھی الجھاتے رہے۔ پچھلے باب میں زبان کے مسئلے پر گاندھی جی کے مقالات کے مجموعہ "لنگوئج پرابلم" کا ذکر آچکا ہے۔ اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قومی زبان کے بارے میں ان کا ذہن صاف نہ تھا۔ وہ دل سے تو یہ چاہتے تھے کہ قومی زبان ہندی ہو اور بات ہندوستانی کی کرتے تھے۔

انہوں نے ہندی کی تبلیغ کو اپنا مستقل مشن بنا لیا اور برابر کچھ نہ کچھ اس مسئلے پر کہتے رہے۔ گاندھی جی اور ان کے اشارے پر اوروں نے زبان کے مسئلے پر جس قسم کا جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا اور جس بے باکی سے ہندی کو قومی زبان بنانے کا اعلان کیا جانے لگا تھا، اس میں ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت ہونے والے انتخابات کو بڑا دخل تھا۔ اس میں کانگریس کو نمایاں کامیابی ہوئی تھی اور ہندو سیاسی رہنماؤں میں ایک خیال یہ پختہ ہو گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو یکسر نظر انداز کر کے بھی اپنی حکومت بنا سکتے ہیں، چنانچہ انتخاب میں کامیابی اور آئندہ سوراج قائم کرنے کے امکانات نے ان کے حوصلے اتنے بڑھا دئے کہ انہوں نے "ہندوستانی" کو بالا اعلان "ہندی" کر لیا اور جب ۱۹۳۷ء میں فی الواقع مختلف صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہو گئیں تو ہندی کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں جو کچھ تقریر و تحریر میں کہا جا رہا تھا اسے عملی شکل دینے کی کوشش شروع کر دی گئی۔ مدراس، بہار، اڑیسہ، یوپی، بمبئی اور سی پی جہاں جہاں کانگریس کی وزارتیں قائم ہوئیں، ہندی کو "ہندوستانی" کے بہانے آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی۔

اڑیسہ کے کانگریسی وزیر تعلیم بودھ رام دوبے نے قلمدان وزارت سنبھالتے ہی صوبے میں ہندی کے پرچار کی صورتوں پر غور کیا اور سارے مدارس میں ہندی پڑھانے کے احکام جاری کر دئے۔ کٹک کے بعض مدارس میں فوری طور پر ان پر عمل بھی شروع کر دیا گیا۔[۳۲]

بہار میں بھی کانگریسی حکومت نے یہی کرنا چاہا لیکن مسلمانوں کی مزاحمت کے سبب خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی، جب "ہندوستانی" کی واضح شکل متعین کرنے کے سوال پر زیادہ اختلاف بڑھا تو پٹنہ کی مقامی شاخ کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء کو ایک خاص جلسہ منعقد کیا۔ اس میں مختلف شہروں کے اساتذہ، مصنفین، ماہرین تعلیم

اور ناشرین شریک ہوئے۔ ہندی کے حامی اور کانگریس کے بعض رہنماؤں نے بھی اس میں شرکت کی اور علامہ سلیمان ندوی کی صدارت میں ایک قرار داد اتفاق آرا سے یہ منظور کی گئی کہ:

"ہندوستانی زبان کے قواعد اور اصطلاحات لغات کے لئے بہار حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جس میں انجمن ترقی اردو اور ہندی کی نمائندہ جماعت کے قائم مقام مساوی تعداد میں شریک ہوں۔ اس کمیٹی کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو، اتفاق سے کام لیا جائے لیکن اختلاف کی صورت میں اردو کتابوں کے متعلق انجمن ترقی اردو اور ہندوستانی کی ہندی کتابوں کے متعلق، ہندی انجمن کے قائم مقاموں کی رائے کو فیصلہ کن سمجھا جائے۔"

اسی دن سہ پہر کو بابو راجندر پرشاد اور صوبائی کانگریس کے سکریٹری نے جلسے میں شرکت کی اور طے کیا گیا کہ ایک متفقہ اعلان، انجمن ترقی اردو کے سکریٹری اور بابو راجندر پرشاد کے دستخطوں سے شائع کیا جائے، چنانچہ دونوں کے دستخط سے حسب ذیل بیان مرتب اور شائع کیا گیا:

"بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء میں ہمیں ہندوستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہمیں فکر تھی کہ "اردو، ہندی، ہندوستانی۔" کے تماشے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، انہیں دور کیا جائے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان میں بڑی حد تک ہم متفق الرائے ہیں۔ چنانچہ ہم کو اس پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہونی چاہئے اور یہ اردو رسم الخط اور دیوناگری دونوں میں تحریر اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لئے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہئے۔ ہندوستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور انتخاب کا معیار یہی عام استعمال یا رواج ہونا چاہئے۔ مزید برآں ہماری رائے ہے کہ ہندی اور

اردو دونوں کو یہ حیثیت ادبی زبانوں کے ترقی ئے کے پورے مواقع دئے جانے چاہئیں۔ ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی اہل علم کے اشتراک عمل سے ہندوستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لغت کی تدوین اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے، ایک مختصر نمائندہ کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہئے جس میں اردو اور ہندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں جو ان دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کی ضرورت کو مانتے ہیں اور ہندوستانی زبان کو ترقی دینے کے قائل ہیں تاکہ اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جائے۔۔

دستخط ....

مولوی عبدالحق

....

بابو راجندر پرشاد[۱]

اس معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے صوبہ بہار کے وزیر تعلیم اور مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود نے بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کے سپرد مندرجہ ذیل کام ہوئے:

۱۔ نصابی کتابوں کی تیاری، تنقیح اور منظوری۔

۲۔ "ہندوستانی" زبان کی لغت کی ترتیب۔

۳۔ ہندی اور اردو کے مصنفین کے لئے اصطلاحات کی تیاری۔

۴۔ جدید طرز پر قواعد کی ترتیب

۵۔ مترجمین کے استعمال کے لئے انگریزی ہندوستانی لغت کی ترتیب۔

کمیٹی کے ارکان میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر غلام السیدین، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ایس سنہا، ڈاکٹر آر بی سکسینہ، پروفیسر بدری ناتھ ورما، ڈاکٹر تاراچند، پروفیسر نریندر دیو، راجہ رادھیا رام پرشاد اور علامہ سید سلیمان ندوی شامل تھے[۲]۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں اس کمیٹی کے اجلاس ہوئے، ڈاکٹر سید محمود وزیر

نے کمیٹی کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد کمیٹی کے ارکان نے اپنا کام شروع کیا، کئی گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ

۱۔ "ہندوستانی" وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں معمولی بول چال اور آپس کے ملاپ کے وقت استعمال کی جاتی ہے اور جو ہندی، اردو کی مشترک بنیاد ہے۔

۲۔ ثانوی درجے تک مختلف مضامین کی کتابوں کی ترتیب و تالیف میں بھی ہندوستانی زبان استعمال کی جانے اور ان کتابوں میں اصطلاحی الفاظ مشترک ہونے چاہئیں۔ ان اصطلاحوں کی بنیاد ہندوستانی الفاظ پر قائم کی جانے اور اس طرح کی اصطلاحیں نہ بن سکیں تو دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر ہندوستانی کے صرف و نحو کے مطابق بنائی جائیں اور کمیٹی کی منظوری کے بعد بہار کے مدارس کی کتابوں میں استعمال کی جائیں۔

۳۔ ایسی ادبی ریڈریں مرتب کی جائیں جن میں

الف۔ ہندی اردو کے مشہور مصنفین کے کلام کے منتخبات شامل ہوں۔

ب۔ سادہ ہندی اور اردو کے منتخبات دونوں کے لئے مشترک ہوں

۴۔ مولوی عبدالحق ہندوستانی زبان کا ایک لغت تیار کریں اس میں وہ تمام عربی فارسی لفظ آجانے چاہئیں جو مستند ہندو مصنفین نے استعمال کئے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی شریک کئے جائیں جو مستند اردو مصنفوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ اس لغت کے جو حصے ہوتے جائیں وہ مولوی عبدالحق ڈاکٹر تاراچند کو بھیجتے جائیں۔

۵۔ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر تاراچند، ہندوستانی زبان کی قواعد تیار کریں۔[۳۶]

مولوی عبدالحق اور بابو راجندر پرشاد معاہدہ، اگر اس پر فی الواقع عمل کیا جاتا تو اردو ہندی تنازع کو رفع کرنے میں بڑا کارگر ثابت ہو سکتا تھا۔ ہر صوبے کے لوگوں کو توقع تھی کہ اس طرح کے معاہدے ان کے یہاں بھی ہو جائیں گے اور "ہندوستانی" کی ایک خاص صورت مرتب کرکے، ہندو مسلمان دونوں کو زبان کے سلسلے میں مطمئن کیا جا سکے گا۔ غالباً اسی امید پر دکھشنا ہندی پرچار سبھا کے ایک اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۷ء کی

صدارت کرتے ہوئے، یعقوب حسن وزیر مدراس نے "ہندوستانی" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا تھا کہ

"ہندی کو ادبی زبان بنانے کی کوشش ابھی زیادہ سے زیادہ پچاس سال سے شروع ہوئی ہے اور چونکہ اس کوشش کی ابتدا اور قومی کانگریس کی ابتدا ساتھ ساتھ ہوئی اس لئے مسلمان اس تحریک کو بھی شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بد قسمتی سے اردو ہندی کا تنازع موجودہ فضا میں اور بھی نقصان رساں ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر بے شک اطمینان ہوتا ہے کہ اس کو رفع کرنے اور دونوں زبانوں کے مبلغین کو ایک نقطے پر متحد کرنے کی کوشش شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق اور بابو راجندر پرشاد کے مابین حال ہی میں جو سمجھوتہ ہوا ہے اس نے ایک ایسی زبان کے لئے میدان تیار کر دیا ہے جس کو ہندو اور مسلمان دونوں کی زبان کہا جا سکے گا۔ اس مفاہمت کی رو سے "ہندوستانی" وہ زبان کہلائے گی جو شمالی ہندوستان میں مشترکہ طور پر سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ لغت میں الفاظ کے داخل و خارج کرنے کا معیار، رواج کو قرار دیا جائے گا اور ہندوستانی کو ملک کی مشترکہ عام زبان بنانے میں ہندو مسلمان دوش بدوش کوشش کریں گے۔ یہ زبان اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی اور تمام دفتری و تعلیمی کاموں میں اس کو استعمال کیا جائے گا۔ نیز اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی نشو و نما کو پوری آزادی ہوگی۔ اس کی بھی کوشش کی جائے گی کہ ہندی اور اردو کے اہل زبان باہم مشورے اور تعاون سے اساسی ہندوستانی کی لغت مرتب کریں۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ایک مختصر سی نمائندہ کمیٹی زبان کے متعلق دوسرے اہم مسائل مثلاً فنی اصطلاحات وغیرہ کا فیصلہ کرے۔"[۲۲]

لیکن بہار کمیٹی کی سفارشات کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا، ابتدا میں کچھ کام ہوا، پھر کانگریس حکومت نے دانستہ اس سے گریز اختیار کرنا شروع کیا۔ مولوی عبدالحق نے ہندی اور اردو کے ماہرین کی مدد سے "ہندوستانی" کی مجوزہ لغت بھی مرتب کرا دی اور اس کا مسودہ بھی کمیٹی کو پیش کر دیا، لیکن پھر نہ پتہ چلا کہ وہ کہاں گیا اور بہار کی صوبائی حکومت نے اسے کیوں درخور اعتنا نہ جانا۔ اسی زمانے میں محمد اجمل خان نے اردو کے بنیادی

لفظوں کی ایک طویل فہرست تیار کی۔ جس میں عربی، فارسی، سنسکرت اور مقامی بولیوں کے وہ سارے الفاظ شامل کر لئے جو اردو میں مستعمل ہو سکتے تھے۔ مرتب کا خیال تھا کہ:

"اردو یا ہندوستانی کو سنسکرت سے نہیں مروجہ زبانوں کے قریب تر لانے کی ضرورت ہے۔"

چنانچہ انہوں نے اپنی مرتبہ فہرست کی ابتدا میں لکھا کہ:

"جو لوگ ہماری زندہ بولیوں کو سنسکرت کے قریب لانا چاہتے ہیں وہ خود ایک ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جو اول تو فطرت انسانی کے خلاف ہے اور اگر بفرض محال ہم مان بھی لیں کہ مذہبی جذبات پر رجعت پسندی کا نام زندہ رکھا جا سکتا ہے تو کیا یہ زبان ملک کی خدمت کے لائق کہی جا سکتی ہے؟ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس طرح پانی نے سنسکرت کے لئے گرامر کے جامد اور ٹھوس قواعد بنا کر اسے مردہ کر دیا اسی طرح ہندوستانی زبان کو سنسکرت کے ذریعے سے ترقی دینے والے، ہندوستانی بولنے والوں کی سماجی اور ادبی زندگی کا جنازہ نکال دیں گے۔ لفظوں کے پسند کرنے میں ہمیشہ رواج پر نظر ہونا چاہئے، یہ خیال ہی تنگ نظری پر مبنی ہے کہ فلاں لفظ دیسی ہے اور فلاں بدیسی۔"[۳۸]

لیکن یہ ساری کوششیں یوں بے نتیجہ ثابت ہوئیں کہ کانگریس نے حکومت کے زعم میں معاہدے کی کسی شق کو عملاً روبکار نہ آنے دیا اور سرکاری دستاویز اور کاغذات میں، سنسکرت آمیز ہندی استعمال ہوتی رہی۔

کانگریس وزارتیں، ہندی کی حمایت اور اردو کی مزاحمت میں عملاً اتنی آگے بڑھ گئیں کہ نہ صرف مسلم لیگ یا انجمن ترقی اردو کے ہمدردوں کو بلکہ سبھی کو اس سلسلے میں شکایت پیدا ہوئی۔ خود کانگریس کے اندر اس مسئلے پر اختلاف رائے رونما ہوا اور بعض ایسے ممبر شاکی ہو گئے جو اس سے پہلے اردو والوں کی شکایت کو صرف فرقہ واریت پر مبنی خیال کرتے تھے، چنانچہ مشہور اشتراکی اور کانگریسی لیڈر، ڈاکٹر اشرف کو، جنہوں نے کانگریس کے شعبہ اطلاعات کی طرف سے گاندھی جی کی ہندی سمیلن کی کارروائی کی تائید میں ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ کانگریس سے شکایت پیدا ہوئی اور انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک اجلاس میں باقاعدہ مندرجہ ذیل تحریک پیش کی:

"چونکہ سارے ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے اور چونکہ ہندی اردو کی بحث نے ایک فرقہ وارانہ صورت اختیار کر لی ہے اس لئے یہ کمیٹی اس بات کو دھراتی ہے کہ کانگریس ہندوستانی زبان کو جو اردو اور دیو ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ہندوستان کی قومی زبان مانتی ہے اور تمام کانگریس والوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ ہندوستانی زبان کو مقبول بنانے کی کوشش کریں اور ہندی اردو کی بحث سے الگ رہیں۔ یہ کمیٹی ایک "ہندوستانی بورڈ" مقرر کرتی ہے جو ہندوستانی زبان کی ترقی کے واسطے ایک جامع تجویز، کانگریس کے سالانہ اجلاس سے پہلے مرتب اور پیش کرے[۳۲]"

ڈاکٹر اشرف نے تحریک پیش کرتے وقت اپنی تقریر میں کہا کہ:

"ہندوستانی سینکڑوں برس کے میل ملاپ سے پیدا ہوئی ہے۔ اب اردو کے مقابلے میں ہندی کا لفظ اختیار کرنا بلاوجہ ایک خطرناک تفرقہ پیدا کرنا ہوگا۔"

انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ:

"ہماری زبان نہ تو ہندی ہے، نہ ہندی ہندوستانی، بلکہ صرف ہندوستانی ہے، جو لوگ اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں وہ رجعت پسند ہیں۔"

انہوں نے مزید کہا:

آپ کو میرے الفاظ ناگوار محسوس ہوتے ہوں گے لیکن میرے سامنے وہ تجربات ہیں جو مجھے مسلمانوں کے ساتھ کام کرنے میں ہوتے ہیں۔

یہ معاملہ اگرچہ تمدنی قسم کا ہے لیکن جو لوگ سیاسی میدان میں کام کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کی شکل سیاسی ہو چکی ہے۔ لوگ ہندوستانی کی جگہ ہندی لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس سے درحقیقت غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں اور اس لئے میں آپ سے کہوں گا کہ اپنی سرگرمیوں میں اردو کا بھی خیال رکھیں[۳۳]

ڈاکٹر اشرف نے یہ تحریک خالص وطنی اور سیاسی مصالح کی بنا پر پیش کی تھی لیکن کانگریس کمیٹی نے کثرت آرا سے بے تکلف اسے مسترد کر دیا، اس تجویز سے اختلاف کیا بھی تو سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے، حالانکہ چند مہینے پہلے وہ خود مولوی عبدالحق

کی درخواست پر کانگریسی حکومتوں کے نام ایک گشتی خط، اس ہدایت کے ساتھ بھیج چکے تھے کہ وہ ہندی کے بجائے "ہندوستانی" کا استعمال کیا کریں۔ لیکن یہ صرف دکھانے کی باتیں تھیں۔ پیغامات و بیانات میں کانگریسی لیڈر اور کانگریسی حکومتیں "ہندوستانی" ہی کا لفظ استعمال کرتی رہیں لیکن سرکاری کاغذوں اور کارروائیوں میں ہر جگہ "ہندی" لکھا جاتا رہا اور عملاً "ہندی" ہی کو ترقی دینے کی کوشش کی جاتی رہی۔

ڈاکٹر عبدالعلیم، اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری تھے اور پکے اشتراکی، اس لئے عام ہندو اور مسلمانوں سے الگ قومی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی سیاست میں وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ہم خیال اور اس کی حکمت عملیوں کے مداح تھے، چنانچہ "نیا ادب" (لکھنؤ) میں ان کے مضامین، مروج اردو کے بجائے گاندھی جی کی مجوزہ "ہندوستانی" زبان میں چھپتے تھے، یعنی اردو کو ہندوستانی کرنے کی فکر میں وہ کثرت سے ہندی کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ لیکن جب گوالیار کے ایک جلسے میں ڈاکٹر امرناتھ نے "انجمن ترقی پسند مصنفین" کے بارے میں یہ حکم لگایا کہ:

"یہ نوجوان مسلمانوں کی جماعت ہے۔ ان کی زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ بہت ہوتے ہیں۔ انجمن کے نام سے بھی کچھ ایسا ہی شبہ ہوتا ہے"[۱۱]

تو ڈاکٹر عبدالعلیم بھی ہندوستانی اور ہندی کے سلسلے میں خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے نومبر ۱۹۳۹ء کے "نیا ادب" میں "ہندی ساہتیہ سمیلن کی بھول" کے عنوان سے ایک طویل اور سخت اداریہ لکھا اور اس کے ابتدائی پیراگراف میں کہا:

"سمیلن کی انٹھائیسویں بیٹھک کی کارروائی اخباروں میں کچھ ادھوری اور سرسری دیکھنے میں آئی تھی جس سے کچھ جی کڑھا اور کچھ اچنبھا سا ہوا خاص کر یہ بات دھیان میں آئی کہ اس کے کارکرتا راشٹر پتی راجندر پرشاد اور شری پرشوتم داس ٹنڈن جیسے سوجھ بوجھ کے لوگ ہیں تو اور زیادہ اچرج ہوا۔ کانگریس کے بڑے بڑے نیتا جس جلسے میں شریک ہوں اس میں ایسی باتیں کہی جائیں، دل میں یہ بات اترتی نہ تھی لیکن "سمیلن کے انٹھائیسویں ادھویشن کے سونکرت نشچے"۔ جب اپنی آنکھوں سے دیکھیں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اچنبھا اس پر ہوا کہ ایک ایسی سبھا جو ہندوستان کے سب سے بڑے ساہتیہ کی ٹھیکیداری کا

دعویٰ کرتی ہو ایسی تنگ دل اور تنگ نظر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس بیٹھک
میں سب سے پہلے جس چیز کو پیش کیا گیا وہ یہ تھی کہ تانبے اور چاندی
کے سکوں پر ناگری لپی کو بھارت کی سرکار نے ابھی تک استھان نہیں
دیا ہے۔ دوسری بات جو غور کے قابل معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ عدالتوں
میں جو زبان لکھی اور بولی جاتی ہے اس میں عربی اور فارسی کے لفظوں کی
بھر مار ہوتی ہے جس کی وجہ سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ جنتا
کے دکھ سکھ کا خیال ودوانوں کو ہو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے،
لیکن کیا سمیلن کی بھاشا بھی عدالتوں کی طرح نقلی نہیں ہے اور کیا اس کا
یہ دھرم نہیں ہے کہ "سہل بھاشا کا پریوگ جاری کرے۔" پورے
بھروسے کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سمیلن کے پرستاروں کی
بھاشا اتنی کٹھن ہے کہ عام جنتا تو الگ رہی تم پڑھے لکھے لوگ بھی اس
کو سمجھ نہیں سکتے۔ سچ ہے کہ دوسروں کی آنکھ کا تنکا اپنی آنکھ کے شہتیر
سے بھی بڑا معلوم ہوتا ہے۔"[۱۲۶]

مختصر یہ کہ کانگریس حکومتوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت "ہندوستانی"
کو عملاً نظر انداز کیا "ہندی" کو قومی زبان بنانے کی غرض سے اسے تیزی سے ترقی دینے اور
اردو کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ جب مدراس میں ہندی کے خلاف احتجاج کیا گیا تو صوبائی
اسمبلی میں کانگریس کے چیف وھپ مسٹر سیتہ مورتی نے یہ کہہ کر اہل مدراس کی جھوٹی
دلجوئی کرنی چاہی کہ جنوبی ہند میں "ہندی" بہت مقبول ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ
یہاں کے لوگ ہندی کو قومی زبان بنانے کے حق میں ہیں۔ ایک سابق وزیر گوکل چند
نارنگ نے آل انڈیا ساھتیہ سمیلن کے جلسے میں کہا:

"ہندوستان کی ساری زبانوں میں صرف "ہندی" ایسی ہے جو قومی زبان
بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

یوپی کے وزیر تعلیم بابو سمپورنانند نے ناگری پرچارنی سبھا، بنارس کی صدارتی تقریر میں کہا

"اگر ہم جنوبی ہند کے لوگوں کو واقعی ہندی سکھانا چاہتے ہیں تو پھر ہندی
میں کثرت سے سنسکرت الفاظ داخل کرنے چاہئیں۔"

تری پورہ کے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں سبھاش چندر بوس
کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اس اجلاس کی کارروائیوں سے تو پوری طرح واضح ہو گیا کہ

کانگریس "ہندوستانی" کے نام سے صرف "ہندی" کو رائج کرنا چاہتی ہے اور اردو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۹ء کے مدینہ اخبار (بجنور) نے لکھا تھا، کانگریس کے اس اجلاس میں سارے بیج، سارے ٹکٹ، بینر، اشتہارات، سائن بورڈ اور سرکلر وغیرہ ایسی سنسکرت آمیز اور نامانوس زبان میں لکھے گئے تھے جس کا ہندوستانی سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ سب کچھ کانگریس ہائی کمان کی ہدایت اور اس کے مشیر اعلیٰ مہاتما گاندھی جی کے اس بیان کی تعمیل میں ہو رہا تھا جس میں انہوں نے کانگریس کی قرارداد کو پس پشت ڈال کر "ہندوستانی" کے بجائے "ہندی" کو قومی زبان کا نام دیا تھا۔ مولوی عبدالحق بڑے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں کہ:

"میں ایک مدت تک اس الجھن میں رہا کہ کیا وجہ ہے کہ جب کانگریس نے اپنے ریزولیوشن اور اپنے دستور میں صاف طور سے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہندوستان کی زبان "ہندوستانی" ہے تو پھر کانگریس حکومتوں کے وزرا اور کانگریس کے ارکان کیوں بار بار بجائے ہندوستانی کے ہندی کو ملک کی مشترک زبان قرار دیتے ہیں اور جتانے پر اور اپنی غلطی ماننے پر بھی کیوں اپنے اس خیال پر قائم ہیں اور جب موقع آتا ہے تو وہ اپنی تحریر اور تقریر میں ہندی ہی کا راگ الاپتے ہیں۔ بہت دنوں کے غور کے بعد یہ راز کھلا اور وہ یہ کہ کانگریس سے بھی بالا ایک اعلیٰ ہستی ہے۔ جس کے ایک اشارے، ایک لفظ کے سامنے کانگریس کے تمام ریزولیوشن، اس کا دستور اور اس کے ضوابط اور قواعد سب ہیچ ہیں۔ گاندھی جی نے چونکہ ملک بھر میں ہندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اس لئے کانگریس کا ہر وزیر اور ہر رکن وہی کہتا ہے جو مہاتما گاندھی کہتے ہیں، جو نیت امام کی وہی ان کی نیت۔"

اس تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کانگریس کے دور حکومت میں اردو کو جان سے مار دینے کے لئے اسے کس کس طرح نرغے میں لیا گیا، لیکن اپنی سخت جانی اور اپنے چاہنے والوں کی پاسبانی کے سبب وہ سارے خطرات سے بچ نکلی۔ جس شدت اور تیزی سے اس پر حملے کئے گئے اسی شدت اور تیزی سے ان حملوں کی کاٹ کی گئی۔ مولوی عبدالحق جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کی پروفیسری چھوڑ کر اردو کی خاطر اورنگ آباد سے دھلی آ گئے سابقہ فیصلے کے مطابق انجمن ترقی اردو کا مرکزی دفتر بھی دھلی منتقل ہو گیا۔ انجمن

ترقی اردو مولوی عبدالحق کی معتمدی میں اردو کے لئے پہلے ہی سے بہت کچھ کر رہی تھی۔ کانگریس راج میں اس کی سرگرمیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔ ذکر کیا جا چکا ہے کہ انجمن کی تنظیم نو کے سلسلے میں ۱۹۳۶ء میں بمقام علی گڑھ اس کا جلسہ ہو چکا تھا اور انجمن کے کام کی رفتار کو تیز تر اور بار آور بنانے کے لئے شعبہ جاتی کمیٹیاں قائم کی جا چکی تھیں۔ انجمن کا مرکزی دفتر دھلی آگیا تو اورنگ آباد کے مقابلے میں یہاں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے کام کی نگرانی میں آسانی ہو گئی۔

دھلی آکر انجمن نے "ہماری زبان" کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا۔ رسالہ اردو پہلے ہی سے جاری تھا اور اردو ہندی قضیے کے متعلق پہلے ساری خبریں اسی میں التزام کے ساتھ چھپتی تھیں لیکن رسالہ اردو چونکہ سہ ماہی تھا اور تین چار مہینے کے بعد کہیں کوئی شمارہ منظر عام پر آتا تھا اس لئے اردو سے متعلق بیانات و واقعات بہت دیر سے دوسروں تک پہنچتے تھے۔ "اردو" چونکہ خالص علمی و ادبی نوعیت کا پرچہ تھا اس لئے اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ بھی محدود تھا۔ نتیجتاً اردو کی اشاعت و مدافعت کے سلسلے میں اس کی کوششیں کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہوتی تھی۔ ۱۹۳۷ء کے بعد کانگریس نے حکومت کے زعم میں اردو کے خلاف کچھ ایسا طوفان برپا کر رکھا تھا کہ اس سے لمحہ بہ لمحہ باخبر رہنے اور اردو کے حامیوں کو خبردار رکھنے کی سخت ضرورت تھی۔ مولوی عبدالحق نے اسی ضرورت کے پیش نظر "ہماری زبان" جاری کیا۔ اور بلاشبہ "ہماری زبان" نے اس ضرورت کو بدرجہ اتم پورا کیا۔

ہماری زبان مہینے میں دو بار یعنی پہلی اور سولہ تاریخ کو پابندی سے نکلتا تھا اور اس میں اردو ہندی تنازع سے متعلق وہ ساری سرگرمیاں اور سارے واقعات اختصار کے ساتھ آجاتے تھے جو برصغیر میں ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک سرکاری یا عوامی سطح پر رونما ہوتے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ اردو اور ہندی دونوں کی مخالفت یا موافقت میں جو کچھ کہا یا لکھا جاتا تھا وہ سب کچھ اس میں چھپتا تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا تھا کہ حالات کے صرف ایک رخ سے نہیں بلکہ دونوں رخ سے لوگ باخبر رہتے تھے۔ اور نتائج کے اخذ کرنے میں آسانی ہو جاتی تھی مثلاً اردو ہندی کے بارے میں عام طور پر لوگ کس طرح سوچ رہے ہیں؟ "ہندوستانی" کے سلسلے میں ان کا کیا موقف ہے؟ مختلف صوبوں میں ہندی اردو کے لئے کیا کیا ہو رہا ہے؟ صوبائی حکومتوں کا طرز عمل کیا ہے؟ وہاں کے عوام کیا چاہتے ہیں؟ اسمبلیاں اردو ہندی کے سلسلے میں کس قسم کی

سرگرمیوں میں مصروف ہیں؟ وزرا کیا کر رہے ہیں؟ سرکاری سطح پر زبان کے مسئلے کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ عوام کے سوچنے کا انداز کیا ہے؟ کانگریس اور دوسری ہندو جماعتیں اردو کو کہاں کہاں اور کس کس طرح نقصان پہنچانے میں لگی ہیں؟ اور ہندی کی اشاعت و ترقی کے لئے کس طرح کام کیا جا رہا ہے؟ اس قسم کی ساری خبریں ہماری زبان میں پابندی سے چھپتی تھیں اور ان پر تبصرے اور تنقیدیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ اس سے یہ ہوا کہ مختلف صوبوں اور علاقوں کے اردو خواں طبقے میں باہم مشاورت، مواصلت، مراسلت اور اردو کے دفاع میں مشارکت و معاونت کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ ایک صوبے کے لوگ دوسرے صوبے کے لوگوں کی مدد کو پہنچنے لگے اور اردو کے دفاع میں آسانی پیدا ہو گئی۔

دھلی پہنچ کر مولوی عبدالحق نے "انجمن ترقی اردو" کی بنیادیں پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیں۔ اس کے بہی خواہوں، ہمدردوں، معاونوں اور مالی مددگاروں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ رسالہ اردو بدستور جاری رہا۔ نئی کتابوں کی اشاعت کی تعداد سال بہ سال بڑھتی گئی اور اردو پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع تر ہو گیا۔ انجمن کی شاخوں میں کئی گنا اضافہ ہوا اور انجمن کے سفیروں کی تعداد بھی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ خود مولوی عبدالحق انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے ملک کے گوشے گوشے میں پہنچے اور اس کا اردو کی اشاعت و مقبولیت پر بہت اچھا اثر پڑا، سید ہاشمی فرید آبادی نے صحیح لکھا ہے کہ:

"دھلی کا دور مولوی صاحب کے دوروں کی وجہ سے بھی انجمن کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔"[۴۵]

سلسلہ کچھ دن پہلے سے چل نکلا تھا مگر ریاست حیدرآباد سے باہر نکلنے کے بعد سارا برصغیر ان کی جولان گاہ بن گیا۔

مولوی صاحب نے پشاور اور کراچی سے کلکتے اور ڈھاکے تک ہر جگہ کا سفر کیا اور بار بار کیا۔ دو تین سال کے اندر اندر انہوں نے کلکتہ، الہ آباد، علی گڑھ، ناگ پور، ترویتی (جنوبی ہند)، جموں، ترونندرم (جنوبی مدراس)، مدورا، ترچناپلی، حیدرآباد، لاہور، کانپور، پٹنہ، دیناج پور (بنگال) جمشید پور، رانچی، گیا، ٹونک، رام پور، اورنگ آباد، بیجاپور، شملہ، کالی کٹ، مدراس اور بہت سے غیر معروف قصبات و مقامات کا دورہ کیا، بعض شہروں مثلاً پٹنہ، علیگڑھ، ناگپور، لاہور، الہ آباد اور مدراس وغیرہ تو انہیں کئی بار جانا پڑا۔[۴۶]

علاوہ ازیں جگہ جگہ اعلیٰ پیمانے پر اردو کانفرنسیں منعقد کی گئیں، دارالمطالعے اور کتب خانے قائم ہوئے۔ ہندی کے حامیوں نے چونکہ صوبہ پنجاب اور سندھ کو خاص طور پر نشانہ بنا رکھا تھا اور ان کی کوشش یہ تھی کہ اردو کو پنجابی اور سندھی کی دشمن ثابت کر کے زبان کے مسئلے پر مسلمانوں میں انتراق پیدا کرا دیا جائے۔ اس لئے ان دونوں صوبوں کی انجمن ترقی اردو کو خاص طور پر فعال اور متحرک بنانے کی کوشش کی گئی۔ پنجاب میں ہمایوں کے مدیر میاں بشیر احمد نے اردو کے اشاعتی، تبلیغی اور دفاعی کاموں میں خاص طور پر حصہ لیا۔ زبان کے مسائل خصوصاً "ہندوستانی" کے موضوع پر انہوں نے درجنوں اعلیٰ درجے کے مضامین شائع کئے۔ اردو ہندی کا انہوں نے سال بہ سال جائزہ لینا شروع کیا اور ہندی کے حامیوں کے بیانات و جارحانہ اقدامات پر تنقید و تبصرہ کا سلسلہ جاری رکھا، ان کے بعض مضامین کا ذکر اس کتاب کے مختلف ابواب میں جا بجا آچکا ہے، تفصیل کے لئے رسالہ اردو اور ہماری زبان کا فائلیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ پنجاب میں اردو کا دفاعی محاذ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں یوں بھی بہت مضبوط تھا کہ وہ اردو کی اشاعت کا مرکز تھا، پیشتر اردو اخبارات و رسائل وہیں سے نکلتے تھے اور بڑے بڑے اردو چھاپہ خانے بھی وہیں تھے۔ اردو کے ممتاز صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں مثلاً علامہ اقبال مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا ظفر علی خان وغیرہ کی ذات و صفات بھی اردو کے تحفظ میں معاون تھیں، انجمن حمایت اسلام بھی اردو کے سلسلے میں چوکنا اور باعمل تھی۔ انجمن ترقی اردو نے پنجاب کے اس اردو ماحول کو اور بھی سرگرم کار و مستحکم بنا دیا۔

سندھ میں البتہ خطرہ تھا کہ شدید ہندی کے حامیوں کی سرگرمیاں کامیاب ہو جائیں۔ اس لئے کہ کراچی کے روزنامہ "حیات" کے حوالے سے یکم دسمبر ۱۹۳۹ء کے "ہماری زبان" میں جو مضمون نقل ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی کوششیں اس سلسلے میں بہت گہری اور وسیع تھیں۔ بقول ہاشمی فرید آبادی "بڑی چالاکی سے سندھی کو اردو کا مد مقابل بنانے کی تدبیر کی گئی اور کاکا کالیکر نے ۱۹۴۱ء میں "دھونیں کی آڑ میں میں سندھ پر حملہ کیا تھا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بات یہ ہے کہ کراچی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ ۱۹۱۴ء سے قائم تھی اور اردو کے لئے برابر کام کر رہی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں اس کی سلور جوبلی منائی گئی اور افسر امروہوی نے کتابی صورت میں اس کی روئداد شائع کی۔ سر عبداللہ ہارون، حاتم علوی، خان صاحب فضل الٰہی، پیر الٰہی بخش وغیرہ نے خاص طور پر

انجمن کی امداد کی اور اس کے کام کو آگے بڑھایا۔ چنانچہ ان کی کوششوں اور مسلم لیگ کے بعض وزرا کی بر وقت توجہ اور اعانت کے سبب اردو کے خلاف ہندی کے حامیوں کی چالیں کامیاب نہ ہوئیں۔

دھلی میں انجمن کا مرکز قائم ہونے کا ایک نہایت اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انجمن ترقی اردو اور مسلم لیگ میں قریبی رابطہ پیدا ہو گیا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے زبان کے مسئلے پر مشورہ کرنے اور اتفاق رائے سے کسی فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو گئی۔

مولوی عبدالحق کوئی سیاسی آدمی نہ تھے لیکن اردو کے ذریعے مسلمانوں کے ثقافتی آثار کو ہندو ثقافت کی زد سے بچانے کے لئے وہ جس قسم کی خدمات انجام دے رہے تھے وہ بجائے خود مسلم لیگ کی لسانی حکمت عملی کا ایک حصہ تھیں۔ اس لئے مسلم لیگ کے ارکان خاص اور مولوی عبدالحق کے درمیان رشتہ اتحاد استوار ہونے میں دیر نہ لگی۔ خصوصیت سے قابل ذکر بات یہ ہوئی کہ قائد اعظم نے اپنی سیاسی بصیرت و فراست سے کام لے کر اردو کے تعلق سے مولوی عبدالحق کو مسلم لیگ کا ہم نوا بنا لیا۔ نواب صدیق علی خان نے لکھا ہے کہ:

> "مولوی عبدالحق ایک ایسے باعمل آدمی اور ایک ایسے اردو کے حامی تھے جنہوں نے اردو کو تقسیم ہند کا عظیم سبب بنا دیا۔ لوگ خود بخود ان کی طرف کھنچنے لگے۔ خاص بات یہ ہوئی کہ قائد اعظم نے مولوی عبدالحق کو ۱۹۳۷ء کے آل انڈیا اجلاس میں شرکت کرنے اور ہندی اردو کے مسئلے پر جلسے کو مخاطب کرنے کی دعوت دی تاکہ اراکین کونسل، کوئی صائب رائے قائم کر سکیں۔ مولوی صاحب کو جو صرف ایک ڈگر پر چلنا جانتے تھے۔ اپنا ہم نوا بنا لینا قائد اعظم کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں قائد اعظم نے ان کو ہموار کر کے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو بھی بڑی تقویت پہنچائی۔ نیز اختلاف کے ایک ایسے دروازے کو بند کیا جس سے نکلی ہوئی آواز مسلم لیگ کے مفاد کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔"[۴۸]

مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو کے اسی اشتراک و اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ایک طرف انجمن ترقی اردو نے مسلم لیگ کے ارکان اور اسمبلی کے دوسرے مسلمان ممبروں کے سلسلے میں اس قسم کی قرار دادیں منظور کیں کہ:

۱۔ "یہ کانفرنس صوبائی اور مرکزی قانون ساز مجلسوں کے تمام اردو داں ارکان سے خاص طور پر گذارش کرتی ہے کہ وہ اپنی اپنی مجلس میں ہر موقع پر صرف اردو زبان میں تقریر فرمائیں اور اس طریق عمل کو زبان کی دشواری یا کسی قسم کی کسر شان کے خیال سے ترک نہ فرمائیں۔ جبکہ اردو زبان کے استعمال کی کوئی قانونی مخالفت نہیں ہے۔"[۴۹]

۲۔ اس کانفرنس کے نزدیک نہ صرف لسانی بلکہ قومی خود مختاری کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے تمام قومی اور نیم سرکاری اور تجارتی اداروں میں جملہ مراسلات، مباحث، حسابات اور ہر قسم کے کاروبار میں، جہاں تک ممکن ہو اردو زبان کا استعمال کیا جائے۔"[۵۰]

وہاں مسلم لیگ کے ارکان نے بھی ذرا کھل کر اپنے موقف کو بیان کرنا شروع کیا چنانچہ مسلم لیگ کے پچیسویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ پندرہ تا اٹھارہ اکتوبر ۱۹۳۷ء زیر صدارت قائداعظم محمد علی جناح، اردو کے بارے میں راجہ صاحب محمود آباد کی تجویز پر مندرجہ ذیل قرار داد اتفاق آرا سے منظور کی گئی:

"اس خیال سے کہ اردو جو کہ اصلاً ایک ہندوستانی زبان ہے ہندو اور مسلمانوں کے ثقافتی ارتباط سے وجود میں آئی ہے۔ ملک کے بیشتر حصے میں بولی جاتی ہے۔ ہندو مسلم قومیت کے فروغ کے لئے موزوں ترین ہے اور جس کی جگہ ہندوستانی کے نام سے ہندی کو رواج دینے کی کوشش" اردو کے اساسی ڈھانچے ہی کو بگاڑ کر رکھ دے گی اور ہندو، مسلم اتحاد پر بہت خراب اثر ڈالے گی۔ آل انڈیا مسلم لیگ ملک کے سارے اردو بولنے والوں کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے سارے اداروں اور دفتروں میں اپنی زبان کے مفادات و حقوق کے تحفظ کی ہر ممکن کوشش کریں، جہاں اردو علاقائی زبان کی حیثیت رکھتی ہو وہاں اس کے آزادانہ استعمال و ترقی کی راہیں ہموار کریں اور جن علاقوں میں اردو کو کوئی نمایاں مقام نہ حاصل ہو وہاں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اس کی تعلیم اور سرکاری دفتروں، عدالتوں، اسمبلیوں اور مواصلاتی شعبوں میں اس کے استعمال کو حکومت سے منوائیں۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اردو ایک ہمہ گیر زبان بن جائے۔"[۵۱]

۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء کلکتے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا:

"کانگریس کی ساری قرار دادیں جن میں کہا گیا ہے کہ مذہبی، ثقافتی اور لسانی امور کو آئین میں بنیادی حقوق کی حیثیت حاصل رہے گی، محض کاغذی ہیں۔

اس میں ذرہ بھر شک نہیں ہے کہ جس وقت سے کانگریس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی ہے۔ کانگریس نے اس سلسلے میں بڑا ہی تشدد آمیز طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ انہوں نے اسمبلیوں میں "بندے ماترم" کو رواج دینے پر زور دیا اور بڑی مشکلوں سے اسے روکا جا سکا۔ وہ ہندی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے اپنی تعلیمی پالیسی میں جگہ دے رہے ہیں جس کا اثر اگر کلی طور پر تباہ کن ثابت نہ ہوا تو بھی اردو کی ترقی پر بری طرح اثر انداز ہوگا اور اس کی ترویج میں حد درجہ خلل ڈالے گا لیکن اس سے زیادہ خطرناک چیز یہ ہے کہ جس قسم کی سنسکرت آمیز اور ہندو فلسفہ سے لبریز ہندی پڑھائی جا رہی ہے وہ مسلمان بچے اور بچیوں کے ذہنوں پر بھی لاد دی جائے گی۔"[۵۲]

اسی طرح پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس کے پندرھویں اجلاس میں جو کہ ۹-۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو علیگڑھ میں منعقد ہوا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان، ایم۔ ایل۔ اے نے اپنے خطبہ صدارت میں ہندی اور ہندوستانی کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"اردو اور ہندوستانی کا مسئلہ بہت صاف ہے اس پر بحث اور استدلال بہت ہو چکا۔ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کانگریس کی نیت کیا ہے۔ لفظی بھول بھلیوں سے اب ہمیں باہر نکل آنا چاہئے نہ ہم دھوکا دینا چاہتے ہیں اور نہ دھوکا کھانا چاہتے ہیں۔ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ ہم اردو بولیں گے اور لکھیں گے۔ اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دیں گے اور اپنی زبان کو سوائے اردو کے اور کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم نے اس ہندوستان کی خاطر اور ہندوؤں کی خاطر عربی چھوڑی، ترکی چھوڑی اور وہ زبان اختیار کی جو اس ملک میں بنی ہے اور سوائے اس ملک کے کہیں اور بولی اور لکھی نہیں جاتی۔ اب ہم

سب سے کہا جاتا ہے کہ ہم والمیک کی زبان بولیں۔ ہم نہ بولیں گے۔ ہم
ہندو مسلم اتحاد کی خاطر بہت آگے بڑھ چکے اب نہ بڑھیں گے جسے ہم
سے ملنا ہو یہاں آکر ملے۔ ہم اپنی آخری حد پر کھڑے ہیں [۵۳]

زبان کے باب میں انجمن ترقی اردو مسلم لیگ اور اردو کے عام حامیوں کی متحدہ کوششوں اور اپنے موقف پر سختی سے قائم رہنے کی حوصلہ مندیوں کا یہ اثر ہوا کہ اگرچہ ہندی کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں کانگریس کے عزائم وہی رہے لیکن عملی اقدامات کرنے کی ہمت بہت کچھ پست ہو گئی۔ ۱۹۳۹ء کے آخر میں جب کانگریسی وزارتوں کو مستعفی ہونا پڑا تو اقتدار کا وہ زعم بھی باقی نہ رہ سکا۔ جس کی بنا پر اردو کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے گئے تھے۔

اب صورت حال بدلی ہوئی تھی، لیکن مہاتما گاندھی بہت بڑے سیاستدان تھے۔ زبان کے سلسلے میں زیادہ الجھاوے انہیں کے پیدا کردہ تھے۔ سمپورنانند جی، پرشوتم داس ٹنڈن، کاکا کالیکر اور مدن موہن مالویہ جو کچھ ہندی کے لئے کر رہے تھے، وہ بالا علان کر رہے تھے اور ہندی کو اردو پر ترجیح دیتے ہوئے صاف کہتے تھے کہ ہندی ہی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ گاندھی جی بھی یہی چاہتے تھے لیکن ایسی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ کہ مسلمان، کانگریس میں مدغم ہو کر اسے ہندوستان کی واحد قومی نمائندہ جماعت خیال کرنے لگیں اور دو قومی نظریے سے دست بردار ہو کر متحدہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کے حامی بن جائیں۔ اسی خاص غرض سے پہلے انہوں نے کانگریس سے یہ قرارداد منظور کروائی کہ ہندوستان کی آئندہ قومی زبان "ہندوستانی" ہوگی جو اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی پھر ہندوستانی کو "ہندی ہندوستانی" کا نام دیا اور آخر آخر "ہندی" کا پرچار کرنے لگے۔ حتی کہ کانگریس وزارت کے خاتمے کے وقت تک یعنی دسمبر ۱۹۳۹ء میں کل ہندی اردو کانفرنس دھلی کے لئے انہوں نے جو خط لکھا تھا اس میں بھی ہندی کو ہندوؤں کی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا تھا [۵۴]۔ اور ہر طرف سے اس پر لے دے ہوئی تھی۔

گاندھی جی ایک طرف ہندی ساہتیہ سمیلن، ہندی پرچارنی سبھا اور بھارتیہ ساہتیہ پریشد وغیرہ کے جلسوں کی صدارت کرتے ان کے کارکنوں کو مشورہ دیتے اور ہندی کی مقبولیت و اشاعت کے لئے تقریریں کرتے، مضامین لکھتے اور ہندی کے حامیوں سے یہ کہتے کہ ہندوستان کی قومی زبان صرف ہندی ہوگی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو دھوکا دینے کے

لئے کانگریس کی قراردادوں میں "ہندی" کے بجائے "ہندوستانی" درج کرواتے۔ ان کا یہ طرز عمل آخر تک قائم رہا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں کانگریس حکومتوں کے خاتمے کے بعد جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ پاکستان کا مطالبہ روز بروز زور پکڑتا جارہا ہے اور اردو کے حامی کسی قیمت پر بھی "ہندی" کو قومی زبان بنانے پر رضامند نہ ہوں گے تو انہوں نے پھر پینترا بدلا اور بظاہر "ہندی ساہتیہ سمیلن" اور بھارتیہ ساہتیہ پریشد کو چھوڑ کر ہندی کے بجائے "ہندوستانی" کا دوبارہ دم بھرنے لگے۔ اب انہوں نے "ہندوستانی پرچار سبھا" کے نام سے ایک اور انجمن کی بنا ڈالی اور از سر نو اس بات کا تکرار کے ساتھ اعلان شروع کیا کہ ہندوستانی کو اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھا جائے گا اور "ہندوستانی" ہی کو قومی زبان بنایا جائے گا۔ یہ کام گاندھی جی نے ۱۹۴۲ء میں اس وقت شروع کیا تھا جبکہ کانگریس حکومت کے مظالم کے سبب ہندو اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات آخری حدوں کو پہنچ رہے تھے اور تحریک پاکستان نے ایسی قوت پکڑ لی تھی کہ اسے منزل تک پہنچنا آسان ہو گیا تھا۔ جی رام ناتھن نے وضاحت سے لکھا ہے کہ

When he found that his dream of a fusion between Hindi and Urdu did not promise immediate realization, he had to content himself with the thought that Hindi and Urdu would for the time being continue as two languages and that by the efforts of scholars in both languages a resultant language would emerge. He continued to exhort the people to learn both the languages and both their corresponding scripts, Nagari and Persian.

The term Hindustani came to be used exclusively to denote the common language, distinct from both Hindi and Urdu . By 1842 this concept was clearly defined in the constitution of the Hindustani Parchar Sabha formed in that year:

The controversy reached its finale in 1945 when Gandhiji broke his connection with the Hindi Sahitya Sammelan. He realized that his definition of Hindi was not really accepted by the Sammelan. The Sammelan had organized a subordinate body known as Rashtrabhasha Prachar Samithi to propagate Hindi as the national language throughout the country. There was a confusin of thought as to what this body aimed at and what the Hindustani Parchar Sabha founded by Gandhiji aimed at. Gandhiji wanted to clarify that though the Hindi Sahitya Sammelan was mainly concerned with Hindi its subordinate wing, the Samithi, was concerned with Hindustani and thus to ensure that there was no conflict between the activities of the

two bodies. He therefore wrote to Purshothamdas Tandon seeking a clarification. Tandon's reply brought out their difference in clear relief.

In that reply he said:

The Sammelan holds Hindi to be the national language. It regards Urdu as a particular form of Hindi prevailing among a certain section of the people.

The Sammelan works for the propagation of the more generally prevalent form of Hindi; it does not concern itself with the Urdu form. ۵۵

جے۔ داس گپتا نے بھی کم و بیش اسی طرح کا اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں :۵۶

It is in this context that the intensification of the language politics in Uttar Pardesh during this and the subsequent periods can be appreciated. The leaders of the Congress ministry were now eager to introduce Hindi with the official help of their newly acquired political power. As a first step, they introduced the study of Hindi in schools. the Hindi movement, as well as the Hindi elite, now came to feel an exaggerated sense of importance and power, At the same time, this new feeling contributed to an intensification of the conflict between the different factions within the Hindi movement. The leading center of this conflict was the Hindi Sahitya Sammelan. After 1935, Gandhi faced a stiff opposition from the powerful faction led by P.D.Tandon.

In 1942 Gandhi gave up the hope of utilizing the Sammelan and resigned from its leadership, though he did not give up his membership. The same year, together with Nehru and Parsad, he established the Hindustani Parchar Sabha for the dissemination of Hindustani, which would serve, he thought, as the medium of contact and intercourse between various provinces with different provincial languages, and which might come to be used throughout India for social, political, administrative, and other such purposes of the nation. the new organization did not succeed appreciably in winning the bases of support that were built by the Sammelan. ۵۷

ہندوستانی پرچار سبھا دو سال تک کوئی کام نہ کر سکی اس لئے کہ ۱۹۴۲ء میں یعنی جس سال ہندوستانی سبھا قائم ہوئی، کانگریس کو حکومت نے خلاف قانون جماعت قرار دے دیا۔ اس کے اکثر اکابر و رہنما قید کر دئے گئے اور تقریباً دو سال بعد انہیں نجات ملی مسلم لیگ نے اپنی تنظیم کا کام ۱۹۳۶ء ہی سے شروع کر رکھا تھا۔ کانگریس حکومت

کے دور میں اس میں ایسی جان پیدا ہو گئی کہ ۱۹۴۴ء تک وہ ایک طاقتور حریف کی حیثیت سے کانگریس کے سامنے آگئی۔ اب کانگریس کے رہنماؤں نے اپنا سارا زور دو قومی نظریے کی تردید میں صرف کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو کئی سال تک کانگریس کا صدر بنائے رکھا گیا اور جمعیت العلمائے ہند کو بھی دو قومی نظریے کی تردید اور متحدہ قومیت کی تبلیغ پر مامور کیا گیا۔ ادھر گاندھی نے اپنے پرانے حربے یعنی "ہندوستانی" کی تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کو پھر کانگریس کے چنگل میں پھنسانے کی کوشش شروع کر دی۔ ہندوستانی پرچار سبھا کا ایک بڑا جلسہ ۲۶، ۲۷ فروری ۱۹۴۵ء کو واردھا میں منعقد کیا گیا۔ اس میں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور مصنفوں کے ساتھ ساتھ اردو والوں خصوصاً انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ مولوی صاحب اس خیال سے کہ یہ گاندھی کی وہی پرانی چال ہے اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا جلسے میں شرکت کے لئے تیار نہ تھے لیکن جب ڈاکٹر تاراچند اور پنڈت سندر لال وغیرہ کے ذریعے ان پر زور ڈالا گیا تو اس کے آخری اجلاس میں شریک ہوئے۔ لیکن سبھا کا ممبر بننا منظور نہیں کیا۔ اس جلسے میں مولوی عبدالحق نے مختصر سی تقریر کرتے ہوئے کہا:[۵۷]

"بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور (۱۹۳۶ء) میں میری تحریک یہی تھی کہ ہندوستانی اختیار کی جائے۔ گاندھی جی نے اسے رد کر دیا۔ آج دس برس بعد وہی تجویز خود پیش کر رہے ہیں۔ اگر اس وقت منظور کر لیتے تو یہ دس سال کا نقصان نہ ہوتا۔"

اس کے جواب میں گاندھی جی نے اپنی آخری تقریر میں کہا:

"میں نے ۱۹۳۶ء میں مولوی صاحب کو دوست کر کے بلایا تھا وہ دشمن ہو کر گئے۔ غلطی میری تھی میں ان کی بات کو نہیں سمجھا، آج میں اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔"[۵۸]

گاندھی جی نے البتہ یہ کیا کہ "ہندوستانی پرچار سبھا" کے صدر بن گئے اور ہندی ساہتیہ سمیلن سے مستعفی ہو گئے۔ سمیلن سے اختلاف اور استعفے کا سبب یہ تھا کہ ہندی ساہتیہ سمیلن نے اسی اثنا میں "راشٹر بھاشا پرچار سمیتی" کے نام سے اپنی ذیلی انجمن بنالی تھی اور اس کا خاص کام ہندی کا پروپیگنڈا تھا۔[۵۹] گاندھی جی کے "ہندوستانی" کی طرف رجعت کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو والے تو ان کی اس تحریک کو ایک سیاسی چال سمجھ ہی رہے تھے ہندی کے حامیوں نے بھی گاندھی جی کو طنز و تعریض کا نشانہ بنایا۔ سمیلن کے

حمایتیوں نے شکایت بھرے خطوط لکھے اور بعض نے معترضانہ مضامین شائع کئے۔ اس پر گاندھی جی نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اب بھی ہندی کے ویسے ہی درپردہ حامی ہیں جیسے پہلے تھے۔ گاندھی جی کی سازش کا یہ راز اس وقت کھلا جب "ہندوستان اسٹینڈرڈ" اور "امرت بازار پتریکا" میں ان کا ایک خط مندرجہ ذیل فقروں کے ساتھ شائع ہوا:

"میں نے کوئی نئی راہ نہیں اختیار کی۔ بات یہ ہے کہ کبھی ایسا وقت ہوتا ہے جب کسی جماعت سے باہر رہ کر اس کی بہتر خدمات انجام دے سکتا ہوں اور کبھی اندر رہ کر۔ میں اب ہندی ساھتیہ سمیلن سے باہر رہ کر اس کی زیادہ خدمت کر سکتا ہوں۔"[۶۰]

مولوی عبدالحق نے اس خط کے حوالے سے لکھا ہے کہ ممکن ہے مہاتما جی مسٹر ٹنڈن کو بھی دم دلاسا دینا چاہتے ہوں، لیکن اسی سال ان کا "ہریجن سیوک" جو اردو رسم خط میں ان کی ہندوستانی کا نمونہ بن کر شائع ہوا، اس کی زبان بھی وہی مصنوعی اور نامانوس ہندی میں پائی گئی۔ ہندو مسلمان سبھی اردو شناسوں نے اس نئی انشا پردازی کی مذمت کی۔ ۱۹۴۶ء کے "ہماری زبان" ہی میں بیسیوں مضمون اور مراسلے مخالفت میں چھاپے گئے۔[۶۱]

ہندی اردو نزاع سے متعلق یہ بحث مباحثے جاری تھے کہ حکومت نے اس منشا کا اظہار کیا کہ وہ ہندوستان کو جلد سے جلد آزاد کر کے اس کا اقتدار مقامی باشندوں کو سونپ دینا چاہتی ہے چنانچہ ویول پلان اور کابینہ مشن کے نام سے آئینی آزادی کی ہیئت متعین کرنے کے لئے بعض تجویزیں سامنے لائی گئیں۔ لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کا ان تجویزوں پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ آخر کار ۱۹۴۵ء کے آخر میں مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے لئے انتخابات منعقد ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں نتائج کا اعلان ہوا۔ مسلم لیگ کو غیر معمولی اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔ سیاست کا رخ بدل گیا۔ اب پانسہ کانگریس کے ہاتھ میں نہیں مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھا۔ جون ۱۹۴۶ء میں وائسرائے نے ایک بیان کے ذریعے اس بات پر زور دیا کہ بلا تامل و تاخیر نمائندہ ہندوستانی حکومت کا قیام ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی وائسرائے نے چودہ ممتاز سیاسی رہنماؤں کو مرکزی کابینہ میں شمولیت کے لئے دعوت نامے جاری کر دئے ان چودہ میں ایک سکھ، ایک عیسائی، ایک پارسی، ایک اچھوت اور پانچ پانچ ارکان کانگریس اور مسلم لیگ سے تھے۔ کانگریس نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ حکومت نے کانگریس کے اس

اقدام سے مرعوب ہو کر پنڈت جواہر لال نہرو سے بات چیت کر کے بارہ آدمیوں پر مشتمل ایک نئی کابینہ تشکیل دی۔ جس نے یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کو حلف وفاداری اٹھایا۔ مسلم لیگ نے البتہ اس نئی کابینہ کا بائیکاٹ کیا اور ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو راست اقدام منانے کا اعلان کیا اسی اثنا میں کانگریس نے مسلم لیگ اور مسلمانوں کے خلاف ایسا اشتعال انگیز رویہ اختیار کیا کہ سارے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ چار و ناچار ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے بھی عبوری کابینہ میں شرکت منظور کرلی۔ لیکن دستور ساز اسمبلی کے بائیکاٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کشمکش جاری ہی تھی کہ برطانوی حکومت نے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو یہ اعلان کیا کہ چند مہینوں کے اندر اندر اقتدار بہرحال ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا جانے گا۔ چنانچہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اقتدار کی منتقلی کے منصوبے کا اعلان ہو گیا۔ ریڈ کلف جیسے انصاف دشمن ثالث نے ہندوستان کی تقسیم اور سرحدوں کے تعین کا کام انجام دیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو "پاکستان" ایک نئی آزاد اسلامی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آگیا۔ گویا اردو ہندی تنازع کے حوالے سے سرسید احمد خاں نے ۱۸۶۷ء میں ان الفاظ کے ساتھ:

"مجھے یقین ہے کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا محال ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

جو پیشین گوئی کی تھی وہ اسی (۸۰) سال بعد پوری ہوئی۔

حواشی

۱۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص۔ ۲۴۱
۲۔ ہندوستانی کیا ہے، مکتبہ جامعہ، دھلی، ۱۹۳۹ء
۳۔ نو نیشن تھیوری، ص۔ ۸ ۶ ۶
۴۔ ہماری قومی جد و جہد (۱۹۳۸ء)، البیان، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۔ ۱۶۳
۵۔ شاہراہ پاکستان، انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص۔ ۳ ۸ ۶
۶۔ "اقبال کے آخری دو سال"۔ اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص۔ ۶ ۵ ۴
۷۔ میموریز اینڈ رفلکشنز، سمپورنانند، لندن، ۱۹۶۲ء، ص۔ ۹۶
۸۔ بے تیغ سپاھی، الائز بک کارپوریشن، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص۔ ۱۴۱
۹۔ انڈیا ونز فریڈم، دی ادر سائڈ، از عبدالوحید خان، پاکستان ایجوکیشن پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص۔ ۹۳ تا ۹۴

۱۰۔ بیسک نیشنل ایجوکیشن، ہندوستانی تعلیمی سنگھ، واردھا (سی پی)، جولائی ۱۹۳۸ء، طبع چہارم

۱۱۔ ٹو نیشن تھیوری، ص۔ ۶۹۳ تا ۷۰۲

۱۲۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص۔ ۲۱۸

۱۳۔ ہماری قومی جدوجہد، ۱۹۳۸ء، ص۔ ۲۳۲

۱۴۔ ہماری قومی جدوجہد، ۱۹۳۹ء، ص۔ ۳۳۳ تا ۳۳۵

۱۵۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص۔ ۱۵۹

۱۶۔ پاکستان منزل بہ منزل، ص۔ ۱۷۲

۱۷۔ پاکستان منزل بہ منزل، ص۔ ۱۹۳

۱۸۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص۔ ۲۵۰

۱۹۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص۔ ۲۶۳، ص۔ ۲۸۲، ص۔ ۳۰۰

۲۰۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص۔ ۳۳۸

۲۱۔ پاکستان منزل بہ منزل، ص۔ ۲۷۹

۲۲۔ ہماری زبان (دہلی) بابت اپریل ۱۹۳۹ء ص۔ ۹

۲۳۔ نگار (لکھنؤ)، اگست ۱۹۳۶ء، ص۔ ۵۰

۲۴۔ نگار (لکھنؤ)، اگست ۱۹۳۶ء، ص۔ ۵۰

۲۵۔ اردو، جنوری ۱۹۳۷ء ص۔ ۱۲۸ تا ۱۲۹

۲۶۔ اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص۔ ۳۷۱

۲۷۔ اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص۔ ۳۷۰

۲۸۔ اردو، جنوری ۱۹۳۷ء، ص۔ ۲۰۲ تا ۲۰۵

۲۹۔ اردو، اپریل ۱۹۳۷ء، ص۔ ۳۳۹

۳۰۔ اردو، جنوری ۱۹۳۷ء، ص۔ ۱۸۹

۳۱۔ اردو، جولائی ۱۹۳۷ء، ص۔ ۶۵۱

۳۲۔ اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص۔ ۳۷۳

۳۳۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۷۷ تا ۷۸

۳۴۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۷۸

۳۵۔ اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص۔ ۳۵۳

۳۶۔ اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص۔ ۳۵۳ تا ص ۳۵۷

۳۷۔ اردو، جنوری ۱۹۳۸ء، ص۔ ۱۷۰

۳۸۔ اردو، جنوری ۱۹۳۱ء، ص۔ ۳

۳۹۔ اردو، ۱۹۳۷ء، ص۔ ۴۳۲

۴۰۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۹۰، اور "اردو"، بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء، ص۔ ۱۱۳۰

۴۱۔ ہماری زبان (دہلی)، ۱۶ دسمبر ۱۹۳۹ء، ص۔ ۱

۴۲۔ ہماری زبان (دہلی)، ۱۶ دسمبر ۱۹۳۹ء، ص۔ ۸

۴۳۔ ہندوستانی اے پولیٹکل لینگولسٹک کیچ ورڈ، دین محمد، امرتسر، ۱۹۳۹ء، ص۔ ۵۱ تا ۵۰

۴۴۔ اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص۔ ۴۷۱

۴۵۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۱۱۶

۴۶۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "ہماری زبان"، ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۳ء

۴۷۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۱۳۸

۴۸۔ بے تیغ سپاہی، ص۔ ۱۴۷ تا ۱۴۸

۴۹۔ روئیداد کل ہند اردو کانفرنس، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص۔ ۶۵

۵۰۔ روئیداد کل ہند اردو کانفرنس، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص۔ ۶۹

۵۱۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص۔ ۲۷۹

۵۲۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص۔ ۲۹۴

۵۳۔ ہماری زبان، یکم مئی ۱۹۳۹ء، ص۔ ۱۵

۵۴۔ ہماری زبان، ۱۶ جنوری ۱۹۴۶ء، ص۔ ۶

۵۵۔ ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ نیشنل انٹیگریشن، ص۔ ۱۲۴ تا ص ۱۲۵

۵۶۔ لینگوئج کنفلکٹ اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ، ص۔ ۱۱۸ تا ص ۱۱۹

۵۷۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۱۶۰

۵۸۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۱۶۱

۵۹۔ ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ نیشنل انٹیگریشن، ص۔ ۱۲۵

۶۰۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۱۶۱

۶۱۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۔ ۱۶۲

اردو زبان کا اصلی مولد: سندھ

(پیر حسام الدین راشدی)

اردو کو سب سے پہلے تحریر میں لانے کا فخر تو ملک دکن کو حاصل ہوا لیکن یہ اردو وہاں کی پیداوار نہیں تھی، بلکہ دہلی سے دولت آباد آئی اور پھر گلبرگہ۔ بیدر۔ بیجاپور وغیرہ مقامات میں شائع ہوئی تھی۔ یوں بھی ظاہر ہے کہ ہر زبان پہلے صرف بول چال میں رواج پاتی ہے اور ایک مدت کے بعد تحریر میں آیا کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری اردو سب سے پہلے کہاں پیدا ہوئی اور کب بول چال میں آئی۔

یاد رہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی وہ مشترکہ زبان ہے جو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور حکومت اور تمدنی روابط کی بدولت اس طرح وجود میں آئی کہ اسلامی زبانوں کے ہزارہا الفاظ ہندی زبانوں میں شامل ہوگئے۔ اور اہل ہند ہندو ہوں یا مسلمان انہیں سمجھنے اور بولنے لگے۔ بے شبہ اردو کو اپنی موجودہ معیاری شکل اختیار کرنے میں بہت مدت صرف ہوئی اور مختلف مدارج اور مراحل سے گزرنا پڑا لیکن اگر اس کے وجود میں آنے کا وہ سبب جو اوپر بیان ہوا مسلم ہے تو یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے۔ اور یہیں ان کی زبان "عربی" اور پھر "فارسی" کا ہندی زبانوں سے ارتباط و اختلاط شروع ہوا۔ لہٰذا یہ ایک واضح امر ہے کہ اردو کا اصلی مولد سندھ ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے تک اردو کی ابتدا مغل بادشاہوں کے عہد سے منسوب کی جاتی تھی۔ جب مغلوں سے پیشتر زمانے کی دکنی کتابیں مل گئیں تو بعض صاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ زبان "بہمنی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں کی ساختہ ہے۔ دو چار آوازیں گجرات کے متعلق بھی بلند ہوئیں، پھر مشہور فاضل حافظ محمود شیرانی مرحوم نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ غالباً یہ زبان عزیز جہلم و چناب کی وادیوں میں پیدا ہوئی اور ستلج اور راوی کی گودیوں میں پلی تھی۔ شیرانی مرحوم کے نظریے کی بنیاد لسانی تحقیق کے تقابلی اصول پر رکھی گئی ہے اور ہماری تلاش کا یہی راستہ ہونا بھی چاہئے۔ لیکن خود شیرانی صاحب ایک وسطی منزل میں ٹھٹھک گئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر گزارش کیا گیا مسلمانوں کا اہل ہند سے

مستقل رابطہ وادی سندھ میں قائم ہوا۔ اور۔یہیں آپس کے میل جول سے لا محالہ انکی زبانوں میں اختلاط کے عمل کا آغاز ہوا۔ جو حضرات سندھ کی اسلامی فتح اور بعد کی تاریخ سے واقف ہیں وہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے اس قول کو ماننے میں ذرا بھی تامل نہ کرینگے کہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ سندھ ہے۔ مولانا نے موصوف نے سنہ ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ہندوستان میں ہندوستانی۔ کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ جو ان کی تقریروں کے مجموعے "نقوش سلیمانی۔ (صفحہ ۱۹ تا ۷۷) میں شائع ہوچکا ہے۔ اس میں صاف صاف اعتراف کیا گیا ہے کہ "جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔" (صفحہ ۳۱) لسانیات اور تاریخ کی تفصیلی بحث چھیڑنے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن ہم بہت ہی مختصر طور پر یہاں یاد دلانا چاہتے ہیں کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں (یعنی آٹھویں اور نویں صدی عیسوی) خلافت اسلامیہ سے "سندھ۔ کے نہایت قریبی اور قومی سیاسی۔ علمی۔ تجارتی۔ اور تمدنی تعلقات رہے۔ ملتان و" منصورہ۔ میں (جو شہداد پور کے قریب آباد ہوا اور آزاد عرب ریاست کا بارونق صدر مقام بن گیا تھا۔) چوتھی صدی ہجری کے آخر تک عربی اور سندھی زبان عام طور پر بولی جاتی تھی جبکی "اصطخری "ابن حوقل۔ اور مسعودی وغیرہ ہم عصر مصنفوں نے شہادت دی ہے۔ اسی زمانہ میں اصطخری لکھتا ہے کہ مکران کے شہروں میں فارسی اور مکرانی کا رواج تھا (مسالک الممالک صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۸) چوتھی صدی ہجری میں۔یہی نئی فارسی جو عربی کا دودھ پی کر پلی اور بڑھی تھی، ایران سے بھی زیادہ ترکستان۔ خراسان۔ اور غزنیں میں نشوو نما پارہی تھی۔ اسی عربی آمیز فارسی نے آگے چلکر زبان اردو کی دایہ گیری کی خدمت انجام دی ہے۔ عرب کی قوت میں زوال آیا تو سندھ پر پہلے سلاطین غزنیں اور پھر غوریوں کا تسلط ہوا۔ شہاب الدین کے امیر "قباچہ۔ نے سندھ میں آزاد حکومت قائم کی تھی مگر اسی کی زندگی میں ترکوں کی ایک بڑی سلطنت دہلی میں بنی اور سندھ پر انہی کا قبضہ ہوگیا۔ اگرچہ آئندہ تیموری مغلوں کے آنے تک جب کبھی دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوتی سندھ کے رئیس خود مختار ہوجاتے تھے۔

ابتدائی دور میں عراق اور عرب سے ہزاروں خاندان سندھ میں آکر بسے۔ اور "دیبل۔ سے "ملتان۔ تک ان کی بیسیوں چھاونیاں اور نوآبادیاں پھیلتی چلی گئیں۔ پھر ان علاقوں سے جو اب افغانستان۔ بلوچستان اور سیستان میں داخل ہیں۔ کثیر تعداد میں سپاہی اور کوہی، شہری اور دیہی گروہوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ ان سے بھی بعید اقطاع کے لوگوں کی

بڑے پیمانے پر ایک نقل مکانی وہ بھی جو یورش تاتار کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئی۔ اور ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو اپنے شمالی وطن چھوڑ کر سندھ اور آگے ہندوستان کے علاقوں میں پناہ لینی پڑی۔ یہ آنیوالے عموماً فارسی یا ترکی زبان کی بولیاں بولتے تھے اور ان کی علمی زبان فارسی ہوگئی تھی۔ مسلمانوں کی آمد اور کئی صدی کی سندھ میں بود و باش نے یہاں کی تہذیب و تمدن کا بالکل رنگ بدل دیا تھا۔ اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہاں کی مقامی بولیوں میں ہزاروں الفاظ عربی فارسی کے شامل ہوتے جاتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی یقینی ہے کہ خود نووارد مسلمان اب یہیں کے باشندے ہوگئے اور اپنے گھروں میں ضرور یہیں کی بولیاں بولنے لگے تھے۔ حقیقت میں انہیں شمالی ہند کی مخلوط بولیوں کا نام "اردو" ہے جس کو عرصہ دراز کے بعد سرکاری اور ادبی نثر کی زبان کا مرتبہ دہلی اور لکھنؤ نے نہیں بلکہ فورٹ ولیم کلکتہ کے انگیزوں نے عنایت کیا۔

ہندی السنہ کے ایک فاضل گوری شنکر اوجھا نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ "مسلمانوں کی آمد کے وقت گجرات۔ مارواڑ وغیرہ میں شمال مغربی (یعنی وسط ہند) کے ملکوں میں ایک مخلوط پراکرت بولی جاتی تھی۔ اور " قدیم ہندی۔ کو بنانے میں اس کی بگڑی ہوئی بھاشا کا بڑا حصہ تھا۔ (نقوش سلیمانی۔ ۲۴۔ بحوالہ قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب) انہیں قدیم سندھی اور مغربی ہند کی بولیوں نے اسلامی زبانوں کا سب سے پہلے اثر قبول کیا۔ اور کچھ شک نہیں کہ سندھ اور ملتان ہی میں اردو زبان کا بیج پڑا جو پھول پھل کر ایک تناور درخت بن گیا۔ تاریخی طور پر بھی ابتدائی اردو کی بول چال کی زبان بن جانے کا سب سے قدیم اور پہلا ثبوت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمہ اللہ علیہ کا وہ مختصر مکالمہ ہے جو ان کے قریب العصر تذکرہ " سیر الاولیاء۔ اور دوسری تاریخوں سے ہم تک پہنچا۔ حضرت کی ولادت سنہ ۵۶۹ ہجری (۱۱۷۳۔ ۷۴۔) ہے جبکہ مسلمانوں کا قبضہ سندھ و پنجاب سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ملتان کے ایک گاؤں "کھوت وال۔ میں پیدا ہوئے۔ ملتان ہی میں تعلیم و تربیت پائی۔ سندھ کے شہر اچھ کی ایک مسجد" جامع جاج۔ میں آپ کے قیام اور سخت مجاہدات کا تذکرہ آتا ہے۔ (اخبار الاخبار صفحہ ۵۳ وغیرہ) خود ملتان جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے خاص ملک سندھ کے صدر مقامات میں شامل تھا۔ پنجاب میں اس کی شمولیت بہت بعد کا حادثہ ہے۔ گنج شکر کے آخری ایام بھی نواح ملتان میں بسر ہوئے۔ سنہ ۶۶۴ ہجری (تخ ۱۲۶۵) میں وفات پائی۔ آپ کے ایک خلیفہ بزرگ شیخ جمال الدین کا ہانسی میں انتقال ہوا تو ان کی حرم جو " مادر مومناں۔ کے معزز لقب سے مشہور تھیں شیخ جمال الدین کے فرزند

کو لے کر حضرت گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضرت نے کم سنی کے باوجود ان صاحبزادے، (شیخ برہان الدین) کو خلافت مرحمت کی۔ مادر مومناں نے عرض کی کہ "حضرت خوجا بالا ہے۔۔ حضرت نے فرمایا" مادر مومناں پونم کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔۔

جمعات شاہی۔ تذکرہ الاصفیا۔ جواہر فریدی وغیرہ بعد کے تذکروں میں اور بھی چند لفظ اور جملے حضرت سے اسی ہندی میں منقول ہیں جو بن سنور کر "اردو" کہلائے۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب مد ظلہم نے چند نظمیں اور ایک جھولنا بھی حضرت شیخ فریدالدین کی تصنیف سے بہم پہنچایا اور اپنے رسالے "اردو کی نشوونما میں صوفیہ کا حصہ۔ میں ان کے کئی شعر نقل کئے ہیں۔ مگر نظم کی نسبت ہمارے خیال میں یہ مختصر مکالمہ جس کی صحت میں کلام کی گنجائش نہیں اردو کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری ہی میں جبکہ دکن تو کجا دوآبہ گنگ و جمن بھی مسلمانوں کا وطن نہیں بنا تھا۔ اقطاع سندھ کے اونچے طبقوں میں اردو بولی جانے لگی تھی۔

فاضل شیرانی مرحوم لکھتے ہیں کہ "اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماء اور افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترکہ ہے۔ یہاں تک کہ جمع کے جملوں میں .... ایک ہی قاعدہ جاری ہے، دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد۔ افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں۔۔ (پنجاب میں اردو مقدمہ۔ ج)

پھر شیرانی مرحوم نے اپنی تحقیقات کو اس پر مرکوز کر دیا ہے کہ اس زبان کا سر چشمہ پنجاب کو ثابت کریں۔ جو دسویں صدی ہجری (یعنی مغلوں کے عہد) میں دہلی اور دوآبہ کی زبان بن گئی۔ اور بقول ان کے وہی آگے چل کر اردو بنی۔ لیکن آٹھویں صدی میں چنگیزی مغلوں نے پنجاب کو بری طرح تہ و بالا کیا۔ اور شہر لاہور کی ایسی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی کہ پھر اکبر بادشاہ کے زمانے تک یہ شہر نہیں پنپ سکا۔

قطع نظر اس کے شیرانی مرحوم، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سیدھے راستہ پر چلتے چلتے ایک طرف کو مڑ گئے۔ ورنہ زمانے کی منزلیں طے کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے جو اس مضمون کا عنوان ہے۔

لسانی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن ہماری تحقیقات کا دوسرا باب یوں شروع ہوگا کہ ہم اردو کی ابتدائی نشوونما کا زمانہ ساتویں آٹھویں صدی ہجری کو قرار دیں جبکہ ممالک ہند میں ترک حکومت اور فارسی زبان کا سرکار، دربار اور مدارس و خانقاہ

میں پورا دخل ہو گیا تھا۔ شمالی ہند کی زبانوں میں فارسی کی آمیزش سے "اردو" کا ترکیب پانا ایسی بات ہے جس سے محدود تحقیق کرنے والے بھی انکار نہیں کریں گے۔ ہم ان صدیوں میں سندھ کے کئی شہروں کو اسلامی علوم و فنون اور صنعت و تجارت کے مرکز اور مغرب سے دہلی جانے کی شاہ راہ پر دیکھتے ہیں۔ ان میں ملتان کے علاوہ بھکر ٹھٹھہ اور اچھہ زیادہ مشہور ہیں اخبار الاخبار میں لکھا ہے کہ "سید جلال سرخ۔ جو مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کے دادا تھے بخارا سے پہلے بھکر آئے۔ پھر اچھہ میں سکونت اختیار کی یہ ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ حضرت جہانیاں جہاں گشت کی پیدائش سنہ ۷۰۷ ہجری تحریر ہے۔ اس خانوادے سے سلطان فیروز تغلق کو بڑی ارادت تھی۔ اور حضرت جہاں گشت کئی مرتبہ اس بادشاہ کی درخواست پر دہلی تشریف لائے تھے۔ ہمارے لئے یہ اہم اطلاع "جمعات شاہی۔ (ملفوظات حضرت شاہ عالم) میں محفوظ ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی سید راجو قتال کے حق میں یہ کلمہ فرماتے تھے کہ "اساں خوجے۔ تساں راجے۔۔ خود حضرت قتال نے فیروز شاہ تغلق کو اردو زبان میں خطاب کیا اور یوں مزاج پرسی کی تھی کہ:۔

"کاکا فیروز چنگا ہے۔۔

انہی بزرگ نے اپنے بھائی کے پوتے سید برہان الدین کی جو آئندہ قطب عالم کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت فرمائی تھی۔ قطب عالم کی اچھہ میں ولادت کی تاریخ سنہ ۷۹۰ ہجری ہے۔ پھر وہ گجرات چلے آئے۔ اور احمد آباد میں انتقال کیا۔ ان کے کشف و کرامات اور سلاطین گجرات کی ان سے عقیدتمندی کے بہت سے قصے تاریخوں میں مذکور ہیں۔ اور ھندی یا اسی اردو میں جو وہ سندھ سے لائے تھے کئی جملے۔ گیت اور دوہے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ جن کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن اس مختصر مقالہ کو ختم کرنے سے پہلے ہم آٹھویں صدی کے ایک اور واقعے کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ جو راقم الحروف کے نزدیک اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس عہد میں بھی سندھ کی عام زبان "اردو" تھی۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۷۵۱ ہجری میں سلطان محمد تغلق نے "سومروں" کے صدر مقام "تتہ" پر فوج کشی کی لیکن اسی زمانہ میں بیمار ہو کر وفات پائی۔ پھر فیروز تغلق نے دس برس بعد اسی شہر پر حملہ کیا سامان رسد نہ پہنچنے سے اسے بھی ناکام ہٹنا پڑا۔ تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف میں لکھا ہے (صفحہ ۲۳۱) کہ اس وقت تتہ والے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے یہ تک بندی کی کہ "برکت شیخ پٹھا۔ ایک موا ایک ہٹا۔ (آخری لفظ میں شبہ ہے کلکتے

کی طباعت میں " تھا۔ لکھا ہے۔ پروفیسر "سوزی والا۔ نے اسے " بھکا۔ پڑھا ہے۔ میں اسے "ہنا۔ یا" نہنا۔ خیال کرتا ہوں۔ شیخ حسین عرف "شیخ ہتھا۔ سندھ کے مشہور ولی ہیں۔

صاحب " تحفتہ الکرام۔ نے ان کی ولادت سنہ ۵۶۰ ہجری وفات سنہ ۶۰۶ ہجری تحریر کی ہے۔ (۳۔ صفحہ ۲۵۲) یہ حضرت تتے میں مرجع خلائق تھے۔ اور شہر سے کچھ فاصلے پر ان کا مزار ابھی تک موجود ہے۔ بہرحال یہ کہاوت جو اوپر ہمعصر و معتبر تاریخ سے نقل کی گئی ہے نہ صرف پرانی اردو کا نمونہ پیش کرتی ہے بلکہ اس کا عوامی اور پھر زبان زد ہونا صاف صاف بتاتا ہے کہ ان دنوں جنوب مغربی سندھ کی عام زبان اردو نما تھی۔

علامہ آئی آئی قاضی مرحوم
ترجمہ الیاس عشقی

اردو کیا ہے

(۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء کو خالق دینا ہال کراچی میں یوم اردو کا خطبۂ صدارت)

ہم یہاں یوم اردو منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ وہ خاص وجوہ جو اس غیر معمولی اجتماع کی محرک ہیں۔ ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہیں۔

ابتدا ہی میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ کوئی سیاسی جلسہ نہیں ہے اور جماعتی سیاست سے تو اس کا دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ہمارے آج کے مل بیٹھنے کا مقصد کسی شخص یا ادارے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا بھی نہیں ہے جیسا کہ اس ہال کے باہر شاید کچھ لوگ خیال کر رہے ہوں گے۔

ہم آج یہاں اس لئے مل بیٹھے ہیں کہ اس چیز کو سمجھنے کی کوشش کریں جو ہمارے نزدیک نہ صرف ہمارے بلکہ بلالحاظ مذہب و ملت ہر ہندوستانی کی توجہ چاہتی ہے اور جس کے متعلق ہم میں سے بعض لوگوں کو خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں ہماری بے توجہی اسے گم نہ کر دے چنانچہ ہم اپنے ان بھائیوں کو اپنے نقطہ نظر پر قائل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو اختلاف کی وجہ سے اس مسئلے پر ہم سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے ہیں ہمیں امید ہے کہ اس طرح ہم اپنے ان بھائیوں کو ان کی رائے پر نظر ثانی کرنے میں مدد کر رہے ہیں۔

لفظ اردو کے متعلق بہت سی خیال آرائیاں کی جاتی رہی ہیں۔ اس لئے اس نام کے متعلق اظہار خیال بے محل معلوم نہیں ہوتا۔ ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ لفظ اردو سے اس سرزمین کا بچہ بچہ واقفیت رکھتا ہے۔ اس وقت میں بتانا چاہتا ہوں کہ در حقیقت یہ ان چند الفاظ میں سے ہے جو آریے اپنی آمد کے وقت اس سرزمین میں لے کر آئے تھے۔ یہ ثابت کرنا تو بہت آسان ہے کہ اس کی ابتدا ترکی زبان میں نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ

سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار میں اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ اس غلط فہمی کی وجہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں غلط قسم کا جذباتی رد عمل پیدا ہوتا ہے۔ وہ اسے بدیسی لفظ سمجھتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ عوام کسی حقیقت کا احاطہ کرنے کی کس قدر محدود صلاحیت رکھتے ہیں ہم کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ لفظ (صوبہ سندھ میں بھی) آج تک روزانہ کی بول چال میں مستعمل ہے۔ ہم لفظ اردو (اڑدو) اپنی روزانہ کی بول چال میں "ڈھیر" یا بہت سی چیزوں کے جمع ہونے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ اس مفہوم میں سندھ میں عربوں کی آمد سے تین ہزار سال پہلے سے رائج ہے۔ لیکن اردو (URDU) کا لفظ سندھ یا ہندوستان کی سرزمین پر وجود میں نہیں آیا ہے۔ یہ لفظ ماضی قبل تاریخ سے چلا آتا ہے۔ وہ لوگ جو ہند جرمانی زبان سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ لفظ بیک وقت اسکنڈے نیویا، فارس اور ہندوستان میں موجود پاتے ہیں اور یہی تینوں مقام آریوں کے خاص وطن ہیں قدیم ناردی (NARDIE) دیو مالا میں ہمیں لفظ (URDU) اردو یا ارتھ (URTH) ارتھ ایک دیوی کے نام کی صورت میں ملتا ہے۔ جو تقدیر کی قائم مقام سمجھی جاتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہند جرمانی زبان بولنے والی اقوام نے جب اپنا مشترکہ وطن چھوڑ کر مشرق اور مغرب کا رخ کیا تو یہ لفظ مروج تھا۔ اگر ہم اوستا کی زبان یا قدیم فارسی کو دیکھیں تو یہ لفظ وہاں بھی موجود ہے۔ شہر اردبیل (URD-BIL) اور بادشاہ اردشیر (URD-SHER) کے نام اس دور میں اس لفظ کے مستعمل ہونے کا واضح ثبوت ہیں۔ یہ الفاظ آج بھی سندھی اور جدید فارسی میں یکساں طور پر فوج، چھاؤنی اور بازار کے معنوں میں موجود اور مروج ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے معنی میں اجتماع، ڈھیر اور بھیڑ کا مفہوم مشترک ہے۔

ابتدا ہی سے اردو (URD) کے لفظ میں خوفناک ہونے یا خوف زدہ کرنے کا مفہوم خاص طور پر موجود ہے۔ اسی خوف کی نمائندگی کرنے اور مفہوم کو مجسم شکل میں ظاہر کرنے کی وجہ سے قسمت کی دیوی کو ارد (URD) کہا گیا۔

دنیا کی تاریخ میں ایک ایسا عہد آتا ہے جب زمین کے ہر حصے میں بلا امتیاز جم غفیر یا فوج کو دیکھتے ہی خطرے کا احساس پیدا ہو جاتا تھا۔ آزاد خانہ بدوشی کی اس زندگی میں جب کوئی جم غفیر لوگوں کو غلام بنانے یا ان کے مویشیوں پر زبردستی قبضہ کرنے کے لئے حملہ آور ہوتا تھا تو قدرتی طور پر جم غفیر یعنی لشکر (URD) کو تقدیر سے ہی تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور جو آریئے اسکنڈے نیویا کی طرف گئے وہ اس لفظ کو ان ہی معنی میں بولتے تھے۔

اس کے بعد کچھ نئی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہی لفظ بدل کر فرود (FURP) یا (FUPD) ہو جاتا ہے زبانوں میں اس قسم کی صوتی تبدیلیاں عام ہیں اور اس لفظ کے معنی بھی فوج کے ہیں۔ اس زمانے میں اسکنڈے نیویا کے باشندوں نے ارد (URD) کے مفہوم میں دیویوں کا تصور بھی شامل کر لیا۔ چنانچہ ایک دیوی کا نام فرداندی (FERDANDI) اور دوسری کا نام اسکلڈ (SKULD) رکھا گیا۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ فرداندی (FERDANDI) فرد (FERD) سے بنا ہے۔ اور اسکلڈ (SKULD) ارد (URD) کی بدلی ہوئی صورت ہے جس کا تعلق انسانی سر (SKULL) اور انسانی جسم کے ڈھانچے سے ہے۔ یہ ایک عجیب اشتراکِ معنی ہے۔ جس میں فوج کے علاوہ انسانی سر اور انسانی جسموں کے ڈھانچوں کا مفہوم شامل ہے۔ لیکن ہمیں اس قسم کی تلاش میں زیادہ آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ صرف یہی کہنا کافی ہے۔ فرد (FERD) کے معنی اب بھی فوج ہی کے ہیں۔ جو جرمانی ناموں میں بھی فرڈی نینڈ (FERDINANDI) کی شکل میں موجود ہے۔

اب ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ارد (RUD) آریائی زبانوں کا اہم ترین لفظ ہے جو اب تک زندہ ہے اور جس میں بیک وقت آریائی تہذیب کی ابتدا اور اس کی روح اور اس کے سماجی نظام کی خوبو موجود ہے۔

حضرات۔ یہی لفظ ہے جو جم غفیر (عوام) کی زبان کے نام کے طور پر استعمال ہوا۔ عوام میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ اس دور میں ہم اردو کا ترجمہ (LINGUA FRANCA) عوامی زبان یا (ESPEROUTO) مختلف زبانیں رکھنے والوں کی مشترک زبان کریں گے۔

اب ہم خاص اردو زبان کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس زبان کی بنیاد سنسکرت پر ہے۔ اور اس سرزمین پر سنسکرت نے اپنے ارتقائی دور میں دراوڑی الفاظ جذب کر لئے تھے اور اس کے بعد اس میں فارسی زبان کے اثرات سے (جو سنسکرت کی بڑی بہن ہے) خوبصورتی پیدا ہوئی۔ عرب سے تعلق پیدا ہو جانے کے بعد پانچ سو سال تک جدید فارسی زبان نے ہزارہا عربی الفاظ کو اپنایا۔ (اور اس سے کم یا اس سے زیادہ یہ عمل یورپی زبانوں میں بھی نہیں ہوا ہے) رفتہ رفتہ برصغیر میں اسی عمل نے بلاارادہ اور قدرتی طور پر اردو کو جنم دیا جس طرح انگریزی زبان میں ہزارہا الفاظ عربی، قدیم فرانسیسی زبان کے توسط سے داخل ہو گئے تھے۔ اردو کی بنیاد ہر معنی میں سنسکرت پر ہی استوار ہے۔ ایران کی زبان نے تو صرف اس کے ارتقائی مدارج اور اس کے حسن میں اضافہ کرنے کے عمل میں حصہ لیا ہے۔

یہ ہے اردو کی ابتدا اور اس کے بنیادی مواد اور مادے کی حقیقت!

اس زبان کی زندگی میں موجودہ نازک مرحلے کا سبب جو آج کی شام کے اس غیر معمولی جلسے کے انعقاد کا سبب بھی ہے۔ آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے ہندوستان کے باشندوں میں سے ایک طبقے کی اس زبان کو نقصان پہنچا کر ایسی قدیم اور پس ماندہ بولیوں کی جانب (جو اسلامی تہذیب کے پھیلنے سے پہلے یہاں رائج تھیں) لوٹ جانے اور زبان پر پچھلے سات سو سال کے ارتقائی عمل کو یکسر نظرانداز کر دینے کی سازش۔

یہ وہ زبان ہے جس نے اکبر اعظم کے دور میں تقویت اور اہمیت حاصل کی۔ جب رنگ و نسل کے اختلافات ختم ہو رہے تھے۔ اور مغل ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنے میں فخر محسوس کرنے اور یہاں کی زبانیں شوق سے بولنے لگے تھے، پھر بھی ہمیں برادران وطن کی (اردو کے خلاف) اس خواہش پر تعجب نہیں ہوا۔ ہر جگہ کے عوام میں (جب ان میں یکایک قومیت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو اول اول اسی قسم کی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں اس بات کو واضح کرنے کے لئے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ انگلستان کی تاریخ کا وہ دور جب وہاں ہنری ہشتم اور الزبتھ کی حکومت تھی۔ اس حقیقت کی گواہی دے رہا ہے۔ رومی کلیسا سے علیحدگی اور ایک آزاد قومیت کے شعور کے احساس نے انگلستان کے بہت سے علماء اور اہل قلم کے طبقہ میں انگریزی زبان کو لاطینی الفاظ و تراکیب سے پاک کرنے کی ایک تحریک پیدا ہو گئی تھی اور اس مقصد کو فوراً حاصل کرنے کے لئے سنجیدہ کوشش بھی کی لیکن آخر کار اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اس ملک کے دانش مندوں کے نزدیک ہر اعتبار سے اس کوشش کی مثال ایسی تھی۔ جیسا کسی چہرے سے نفرت ظاہر کرنے کے لئے اس کی ناک کاٹ دی جائے مگر یہ معاملہ نسبتاً آسان تھا۔ رومی اثرات سے گریز کی خواہش انگریزوں میں جذباتی سطح پر تھی۔ مگر نفرت کا اثر اٹلی کے باشندوں پر بالکل نہ تھا۔ لیکن ہندوستان میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ایسے لوگوں کی خواہشات نے معاملات کو حیرت انگیز حد تک الجھا دیا ہے۔

زبان سے ان تمام الفاظ کو نکال دینے کی خواہش جو پچھلے آٹھ سو صدیوں میں داخل ہو کر اس کا جزو بن چکے ہیں۔ نہ صرف اس ترقی سے روگردانی کے مترادف ہے جو اس مدت میں زبان کے بولنے والوں کے ذریعہ ضرورت اظہار اور ان کی خواہشات کی وجہ سے رونما ہوئی ہے بلکہ یہ اس تبدیلی اور ترقی کی بھی نفی کرتی ہے۔ جس میں آج کے بولنے والوں کی کوششیں بھی شامل ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنے موضوع پر آگے بڑھیں ان تبدیلیوں کی نوعیت پر بھی سرسری نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ان تبدیلیوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو کس قدر متاثر کیا ہے۔ ہر وہ فرد جو حقیقت کا احترام کرتا ہے۔ تاریخ سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ اور بلا کسی دشواری کے معلوم کر سکتا ہے کہ یہ طریقہ وہی ہے جو دسویں گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں مغرب اور مشرق میں زبان کی ایک نئی تشکیل کا سبب بنا تھا۔ اور اس نے چودہویں اور پندرہویں صدیوں میں یورپ اور ہندوستان میں احیاء کی شکل اختیار کی تھی۔

ان دونوں براعظموں میں اس علمی انقلاب کی داغ بیل مذہبی اصلاح کی وجہ سے پڑی تھی۔ فرانس میں ایبلارڈ (ABAYLARD) اور انگلستان میں تحریک اصلاح کے بانیوں نے جس میں روجر بیکن (ROGER BACON) بھی شامل تھا۔ اس دور کی نئی زندگی کو متاثر کیا۔ یہ تحریک جرمنی میں لوتھر (LOTHER) کے انقلاب کی صورت میں تکمیل کو پہنچی اور ہندوستان میں اسی دور میں اس نوعیت کی معاصر تحریکوں کو کبیر اور نانک جیسے رہنماؤں نے انتہا تک فروغ دیا۔

اسی انداز پر شاعری اور ادب کو تروبیڈور (TROUBADORS) اور ارسطو (ARISTO) جیسے مقامی پرونسال (PROVINCIAL) شاعروں کی وجہ سے یورپ میں اور ہندوستان میں خسرو کی وجہ سے تبدیلی اور ترقی کے لئے یکساں راہیں کھل گئیں۔ یہ تبدیلیاں براہ راست نتیجہ ہیں اس میل جول کا جو ایک طرف ہسپانیہ اور سسلی اور دوسری جانب پنجاب اور سندھ میں (مختلف قسم کے لوگوں کے درمیان) بڑھ رہا تھا۔

وہ لوگ جو یورپ اور ہندوستان میں ان الفاظ یا ترقی کی اس رو کو روکنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے کامیابی ناممکن ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ پچھلے ایک ہزار سال کی ترقی کو واپس لوٹا دیا جائے۔ اس طرح ہندوستان میں نہ صرف شاعری کا سب سے بڑا اور قابل قدر سرمایہ غائب ہو جائے گا۔ بلکہ مذہبی لڑائی کا منصب سے پہلے والے دور میں لوٹ جانا پڑے گا۔ جس میں بہت سے خداؤں کی پرستش ہوتی تھی اور نہ صرف فن تعمیر کے تمام نمونے جن میں قطب مینار سے لے کر تاج محل اور یوپی بلکہ پنجاب میں راجاؤں اور مہاراجاؤں کے جدید محلوں اور دوسری عمارتوں تک کو مسمار کر دینا پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ مصوری کا مکتبہ بنگال بھی اپنی موجودہ صورت میں برقرار نہ رہے گا۔ اور نہ وہ ایرانی فن جو مغلوں کے ذریعہ نئے میل جول کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوا ہے۔ باقی نہ رہ سکے گا۔

اب تک ہم نے اس ملک میں برادران وطن پر مشتمل طبقے کی امنگوں اور خواہش کا ذکر کیا ہے جو ایک عجیب و غریب تصور رکھتا ہے جو ہر ہندو میں موجود ہے۔ چاہے وہ کسی قدر قدیم کیوں نہ ہو اور جو اس سرزمین پر تین ہزار سال قبل موجود تھا۔ اور جو اس آریئے میں بھی جو اس ملک میں چار ہزار سال قبل ترک وطن کر کے آریوں کے پہلے گروہ کے ساتھ داخل ہوا تھا موجود ملے گا۔ اگر وہ اس تاریخی حقیقت کی تصدیق کرنا چاہتے ہوں تو اسے معلوم ہو گا کہ اسلام کے ساتھ میل جول کے زیر اثر جو ترقی مغرب میں اور ہندوستان میں ایک ہزار سال میں رونما ہوئی ہے وہ دونوں کے لئے مفید ہے۔ نیز یہ کہ اس کے اثرات کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ اور نہ ان کو اجنبی اور بدیسی کہہ کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ان اثرات کا وجود ناقابل برداشت ہے اور ان نشانات کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ اردو بھی ایک ایسا ہی نشان ہے۔

اب ہم تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستان کا ایک اور طبقہ ہے جو عجیب قسم کے تصورات دیکھتا ہے۔ اس طبقے کے خیال کے مطابق بہت ہی محدود تعداد میں تارکین وطن اس سرزمین میں بارہ سو سال پہلے داخل ہوئے تھے۔ اور انہیں کو اپنے آبا و اجداد سمجھتا ہے۔ گویا یہ زمانہ فاتح ولیم کے انگلستان میں قدم رکھنے سے تین سو سال اور کسی بھی نارمن بادشاہ کے فرانسیسی زبان ترک کر کے انگریزی زبان اختیار کرنے سے چھ سو سال قبل کا زمانہ ہے۔ اس جگہ یہ ظاہر کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو بارہ سو سال قبل ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ ہندوستان کی آبادی کا صرف بیسواں حصہ تھے۔ باقی انیس (۱۹) حصے دراوڑ آبادی تھی جو ہندوستان کی سرزمین پر ما قبل تاریخ کے زمانے سے آباد تھی۔

کسی صاحب عقل اور ذی ہوش انسان کے نزدیک برادران وطن میں سے یہ معدودے چند لوگ بھی اس نادانی کا شکار ہیں۔ جس میں وہ لوگ مبتلا تھے۔ جن کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے اور جو تین چار ہزار سال قبل ہندوستان میں آریوں کی آمد والے نظریئے سے استدلال کرتے ہیں کسی بھی ہندوستانی کے لئے جو یہاں پیدا ہوا اور پروان چڑھا ہے اپنے اس قسم کے تعلق سے شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے جو اسے پہلی دراوڑی آبادی یا بعد میں آنے والے آریوں سے رہا ہے۔ وہ شخص جو اس ملک کے آداب، فن، تاریخ، عوام اور ان کی تہذیب پر چاہے وہ مسلمانوں کی آمد سے قبل کے دور سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔ فخر کرتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ انسان کہلانے کے قابل نہیں ہے۔ کوئی

بھی ہندوستانی مسلمان یا غیر مسلم جسے اس بات کے تصور سے تشفی نہیں ہوتی کہ وہ عوام میں شامل ہے اور اس ملک سے تعلق رکھتا ہے جس سے کالی داس اور گوتم کا تعلق ہے وہ اور چاہے کچھ ہو ایک تہذیب یافتہ انسان یقیناً نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی تو ہوا بھی نہیں لگی ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن وہ لفظ اسلام کے معنی نہیں سمجھتا ایسا شخص صرف ہندوستان ہی کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اپنی جہالت کی وجہ سے خود اسلام کو بد نام کرتا ہے۔

اگر ہم اپنے مقصد کی جانب لوٹیں تو معلوم ہو گا کہ اردو زبان ہند ایرانی زبانوں کے خاندان میں سب سے کم عمر اور چہیتی اولاد ہے جو دنیا میں پھیلتے ہوئے تعلقات اور میل جول کی پیداوار ہے۔

جو شخص اُسے اجنبی سمجھتا ہے اور بیسویں صدی میں رہتے ہوئے مہا بھارت کی زبان بولنا چاہتا ہے اور اِن الفاظ میں اضافہ گوارا نہیں کرتا جو ماضی قدیم میں اس زبان میں رائج تھے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے وہ ایک تنگ نظر اور غیر رواداری ذہن رکھتا ہے اور اس کے نزدیک قومیت اور بین الاقوامیت دونوں بے معنی الفاظ ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ روشنی سے نفرت کرتا ہے اور اُلو کی طرح سورج سے بچتا ہے۔

یورپ سے وطن لوٹنے کے بعد پچھلے آٹھ مہینوں میں مجھے جس چیز پر سب سے زیادہ ہنسی آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے وطن دوستی کے بلند آہنگ دعوے کھوکھلے ہیں۔ وہ مادر وطن سے محبت کے دعوے تو کرتے ہیں لیکن انہیں وطن سے زیادہ خود اپنے آپ سے محبت ہے۔

ان میں سے ایک طبقہ اپنا رشتہ اس وقت اور ان حالات سے جوڑتا ہے جو تین ہزار سال قبل کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرا اس سے قطع تعلق ظاہر کرتا ہے اور محض تین سو سال کی تاریخ کو اپناتا ہے۔ یہی اردو زبان کی عمر ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کو ہندوستان سے تعلق خاطر نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے علاوہ جو کسی نہ کسی طرح شکم سیر ہو چکے ہیں۔ اور جو اپنی شکم پری کی وجہ سے غیر ضروری باتوں میں وقت گزار سکتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ لوگ غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب رہ گئے ہیں جب کہ یہ لوگ ان بولیوں کے متعلق لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ جو انہیں پڑھانی چاہئیں۔ سارا ملک جہالت کا شکار ہو رہا ہے۔ ہندوستانی ادب سچ مچ مردہ ہو چکا ہے، ہندوستانی فن دفن کیا جا چکا ہے۔ ہندوستانی دستکاریاں مدت ہوئی ختم ہو چکی ہیں اور ہندوستانی زراعت ایک غیر زرخیز

بے معنی اور بے نتیجہ طریق کار کے دور سے گزر ہی ہے یہ موضوع اختلافات اور فضول مباحثہ کا شکار ہے۔ جن میں پیٹ بھرے لوگ ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں اور وہ ملک جو خدا نے انہیں تحفے میں دیا ہے تاکہ وہ اسے زراعت سے خوبصورت بنائیں۔ ہر لمحہ ابتری میں گرفتار ہو کر بے رونق اور برباد ہو رہا ہے۔ اگر انہیں ہندوستان کا ذرا سا بھی خیال ہوتا تو وہ اس تصور اور ایسے الفاظ کو رد کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے جو آٹھ سو سال کے طویل، ہمہ گیر اور آہستہ خرام ادوار ترقی میں دن رات کے استعمال سے زبان کا جزو بن گئے ہیں جو ساری دنیا میں پہنچے ہیں اور جس کی وجہ سے زبان میں نئے اظہار اور خیالوں کو تقویت ملتی رہتی ہے۔ اگر اس بات کا علم ہو تو ہم ہر اس پھول کی تلاش میں رہیں گے جو جاپان میں اگتا ہے اور ہر اس درخت کی جستجو کریں گے جو برازیل میں ملتا ہے۔ ہر اس پھل کو حاصل کرنا چاہیں گے جو کیلیفورنیا میں دستیاب ہوتا ہے۔ ہمیں ہر اچھی چیز کی تلاش ہوگی چاہے وہ زمین کے کسی حصے میں کیوں نہ پائی جاتی ہو۔ ہم ان چیزوں کو حاصل کر کے اپنی سرزمین کو خوبصورت اور مالا مال بنا کر اپنے ذہنوں اور روحوں کی تربیت کرینگے اور اس سلسلے میں ایک لمحہ بھی ضائع کرنا پسند نہ کریں گے۔ اور ایک لمحہ توقف کئے بغیر انہیں اپنے ملک کے لئے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ کیا ماضی کے کچھ سمجھدار لوگوں کے ہندوستان کا خالق ایک بڑا خدا ہے اور کرہ زمین کے دوسرے حصوں کو دوسرے ادنی درجے کے خداؤں نے تخلیق کیا ہے۔ قومیت کے تصور کے ساتھ اگر عقل بھی شامل ہے تو قطعی لازم نہیں آتا کہ ہم اپنی چیزوں سے محبت کر کے دوسری چیزوں سے نفرت کریں۔ سنجیدہ قومیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بلا کسی جسمانی عقلی اور روحانی مشقت کے اس خطہ ارض کو خوبصورت بنائیں جو ہم کو خدا کی جانب سے ودیعت کیا گیا ہے تاکہ ہم اس سرزمین کی خدمت کرنے میں جو ہمارا وطن ہے کسی دوسری قوم سے پیچھے نہ رہیں۔ ہم کسی ایسی چیز کو بری نظر سے نہ دیکھیں جو کچھ بھی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اس کا وجود چاہے جہاں ہو اور چاہے اسے کسی طریقے سے حاصل کیوں نہ کیا گیا ہو۔ صرف یہی نہیں کہ یہ بات قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جہاں سے جس طرح سے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ بشرطیکہ وہ ہمارے لئے مفید ہو۔ میرے ذہن میں اس کے علاوہ قومیت کا اور کوئی تصور نہیں ہے۔ جو اس کرہ ارض پر کسی سمجھدار آدمی کے لئے قابل قبول ہو۔ کیا اس زمین پر کوئی ایسا باپ موجود ہے (اس غرض سے نہیں کہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو) جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اس کا بیٹا کالی داس کی زبان سے

سنسکرت سیکھے جو اردو زبان کی ماں ہے۔ کیا کوئی ایسا تنگ نظر باپ بھی ہے جو ان تمام خوبصورت تصورات پر فخر نہ کرتا ہو جو اس سرزمین پر پیدا ہوئے ہیں اور جن میں اردو بھی شامل ہے جس کی پیدائش پچھلے نوسو برس میں ہوئی کیونکہ یہی زمانہ مغرب اور ہندوستان میں احیاء العلوم کا زمانہ ہے۔

آنکھیں رکھنے والے لوگوں کے لئے اردو، ایک جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ وسیع المشربیت اور بین الاقوامی قومیت کی علامت ہے اور ایک ایسا نقطہ ہے جس پر دنیا کی بڑی تہذیبیں یعنی ہند جرمانی، سامی اور منگول تہذیبیں آکر ملتی ہیں۔ اور جسے ایشیا کی عام زبان (LINGUA FRANCA) بننا ہے۔ یہ دنیا کی ان بنیادی زبانوں میں سے ہوگی۔ جن سے ساری دنیا کے لئے ایک بین الاقوامی زبان (SPERANTO) کی تعمیر و تشکیل ہوگی۔

کیا اردو کو عامیانہ، محدود اور وہم وگمان سمجھ کر نظرانداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہندوستان کی عصری ترقی ہی نہیں بلکہ اس کے مستقبل کے فروغ کو بھی ترک کیا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت کے سلسلے میں غلط فہمی کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے کہ کچھ ایسے لوگ ان وجوہ کی بنا پر جنہیں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا سنسکرت یا عربی سے نفرت کرتے ہیں اور ان کی نفرت کا کوئی عقلی جواز نہیں۔ اس خطہ ارض سے محبت نہیں ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ انہیں سچائی سے محبت نہیں ہے۔ وہ ایک دقیانوسی قسم کی خودفریبی کے نشے میں چور ہیں۔ جس سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اور جو مستقبل میں ہندوستان کی ترقی سے ذرہ بھر دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان کا وجود ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ماضی میں ہی دفن کر دیا جائے حضرات جس موضوع پر میں آج شام آپ سے گفتگو کر رہا ہوں وہ ختم نہ ہونے والا اور وسیع موضوع ہے اور اس کے بہت سے ایسے رخ ہیں۔ جن پر ابھی اور تفصیل سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس وقت کی گفتگو چاہے کتنی نامکمل اور جزوی کیوں نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو دعوت فکر ضرور دے گی۔

آپ میں سے وہ لوگ جو اپنی پیدائش کی سرزمین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ جواب تک آپ کو پناہ دیئے ہوئے ہے اور جس کے سوا کسی اور زمین پر آپ کو پناہ نہیں مل سکتی۔

اس گفتگو کو میں ایک انتباہ پر ختم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اردو پر جھگڑنے سے پہلے آپ اچھی طرح سوچ لیجئے، جھگڑنے کے لئے ہندی، ہندوستانی (یا کوئی اور ایسا ہی

عجیب نام کیوں نہ ہو جسے آپ پسند کریں) لیکن یہ یاد رکھیے کہ وقت ہاتھ سے نہ نکل جانے اور کہیں اسلنڈری (جرمانی) لشکر (URD) پھر نہ جاگ اٹھے اور آپ پر تخریب کی فوجی طاقت (FRED) کے ذریعے حملہ آور ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو ان ناسمجھوں تنگ نظروں کے سر انجام پر سخت افسوس ہوگا۔ جو تصور کے فقدان کی وجہ سے سنگین نتائج کا اندازہ لگانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔

ہماری چند مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
غالب آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد خاں	۵۰/۰
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰/۰
چراغ رہ شناسائی	مرتبہ: ڈاکٹر حنیف فوق	۳۵/۰
حرفے چند	جمیل الدین عالی	۱۰۰/۰
اردو اور ہندی کے مشترک اوزان	ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی	۷۰/۰
غالب کے خطوط (حصہ اول)	مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم	۸۰/۰
" " (حصہ دوم)	" "	۸۰/۰
" " (حصہ سوم)	" "	۸۰/۰
غزل نما	مرتبہ: ادا جعفری	۱۰۰/۰
ابن انشا	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	۱۵۰/۰
دریائے لطافت	انشاء اللہ خاں انشا۔ ترجمہ: پنڈت کیفی	۲۵/۰
اقبال	احمد دین۔ مرتبہ: مشفق خواجہ	۴۰/۰
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	نظامی دکنی۔ مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی	۵۰/۰
[illegible]	سید حسن برنی	۶۰/۰
سلہٹ میں اردو	مولفہ: محمد عبدالجلیل بسمل	۴۰/۰
تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (جلد اول و دوم)	مرتبہ: سید ہاشمی فرید آبادی	۷۵/۰، ۶۵/۰
گورکی کی آپ بیتی (جلد اول)	میکسم گورکی۔ ترجمہ: اختر حسین رائے پوری	۴۰/۰
مقالات برنی (حصہ اول)	سید حسن برنی	۵۰/۰
پنجابی زبان و ادب	حمید اللہ شاہ ہاشمی	۵۰/۰
داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۲۵/۰
پشتو شاعری	مرتبہ: فارغ بخاری، رضا ہمدانی	۱۵/۰
موج موج مہران (سندھی شاعری)	ترجمہ: ایاز عشقی	۱۵/۰

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ کراچی ۷۴۲۰۰

ہماری چند مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
غالبِ آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد خاں	۵۰/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰/-
چراغ شناسائی	مرتبہ: ڈاکٹر حنیف فوقؔ	۳۵/-
حرفے چند	جمیل الدین عالیؔ	۱۰۰/-
اردو اور ہندی کے مشترک اوزان	ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی	۷۰/-
غالب کے خطوط (حصہ اول)	مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم	۸۰/-
" " " (حصہ دوم)	" " " "	۱۲۰/-
" " " (حصہ سوم)	" " " "	۱۲۰/-
غزل نما	مرتبہ: ادا جعفری	۱۰۰/-
ابنِ انشا	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	۱۵۰/-
دریائے لطافت	انشاء اللہ خاں انشا۔ ترجمہ: پنڈت کیفی	۲۵/-
اقبال	احمد دین۔ مرتبہ: مشفق خواجہ	۴۰/-
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	نظامی دکنی۔ مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی	۵۰/-
البیرونی	سید حسن برنی	۶۰/-
سلہٹ میں اردو	مولفہ: محمد عبدالجلیل بسمل	۴۰/-
تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت۔ (جلد اول و دوم)	مرتبہ: سید ہاشمی فرید آبادی	۷۵/-، ۶۵/-
گورکی کی آپ بیتی۔ (جلد اول)	میکسم گورکی۔ ترجمہ: اختر حسین رائے پوری	۴۰/-
مقالاتِ برنی۔ (حصہ اول)	سید حسن برنی	۵۰/-
پنجابی زبان و ادب	حمید اللہ شاہ ہاشمی	۵۰/-
داستانِ زبانِ اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۲۵/-
پشتو شاعری	مرتبہ: فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی	۱۵/-
موج موج مہران (سندھی شاعری)	ترجمہ: الیاس عشقی	۱۵/-

انجمن ترقیِ اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی۔ ۷۴۲۰۰